بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of

The University of Jammu & Kashmir

June 1, 1957

سناٹا

احمد ندیم قاسمی

"Sannata"

Ahmad Nadim Qasmi

سنّاٹا

سناٹا

احمد ندیم قاسمی

نیا ادارہ ۰ لاہور

پبلشرز: نذیر چودھری، نیا ادارہ، لاہور
پرنٹرز: سویرا آرٹ پریس، لاہور

افسانے

کرشن چندر

کے نام

دیباچہ

اب سے سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے میں نے احمد ندیم قاسمی کے سارے افسانے پڑھے اور انہیں پڑھ کر مختلف طرح کے تاثرات قائم کئے تھے ــــــ کچھ بہت اچھے، کچھ نسبتۃً کم اچھے یا محض اچھے اور کچھ ایسے کہ انہیں برا کہنا تو یقیناً صحیح نہیں، لیکن اچھا کہنے کے بجائے گوارا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ان اَن گنت تاثرات میں سے کچھ تو زندگی کے دبے ہوئے نسبتاً زیادہ شدید اور زیادہ گہرے تاثرات کے نیچے دب کر رہ گئے۔ لیکن کچھ تاثرات بے شمار تہوں کے نیچے دبے ہونے کے باوجود اب بھی ابھر ابھر کر دوسری چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ بات میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ ندیم نے پنجاب کے دیہات کی کہانیاں لکھ کر ہمیں ان کے دلوں کا مکین اور ان کی دھڑکنوں کا ہمراز بنایا ہے، نہ میں یہ بات بھول سکتا ہوں کہ ان کہانیوں میں غم کی خلش اور محبت کے سرور کو برابر کی جگہ ملی ہے اور یہ کہ "لذت و الم" کا یہ مصوّر فطرتاً افسانہ نگار بھی ہے اور شاعر بھی۔

ان بے حد خوشگوار یادوں کے ساتھ میرے ذہن پر ان افسانوں نے یہ اثر بھی چھوڑا ہے کہ افسانہ نگار کی دردمندی صرف دیہات والوں کے لئے مخصوص نہیں، وہ دیہاتوں کی کھلی ہوئی آوارہ و آزاد فضا سے باہر نکل کر شہر کے کوچہ بازار کی گھٹن کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے اور جہاں کہیں کوئی دکھ، کوئی زخم، کوئی ناسور دکھائی دیتا ہے، اس کا مداوا اس کا اور اس کے فن کا نصب العین بن جاتا ہے لیکن جس طرح ہر دکھ کو اپنا دکھ بنا لینا انسان (یا فن کار) کی سکت سے باہر ہے اسی طرح ہر زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش بھی فن کے حق میں مضر ہے۔ موضوعات کی اسی کثرت نے احمد ندیم قاسمی کے تقسیم سے پہلے لکھے ہوئے افسانوں میں ایک گم کردہ راہی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور ان کے دردمندانہ احساس کی اثر آفرینی اور شاعرانہ اندازِ بیان کی دل نشینی کے باوجود مجموعی حیثیت سے پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ فن کار کو اپنی منزل کا پتہ نہیں اور اس لئے وہ ہر جادہ کو اپنا جادہ اور ہر منزل کو اپنی منزل سمجھتا ہے۔ ابھی وہ رہروی کے منصب کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکا ہے، رہبری و رہنمائی تو اس کے بہت بعد کے مدارج ہیں

اب آٹھ برس کے بعد جب مجھے پچھلے دو تین برس کے لکھے ہوئے افسانوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا موقع ملا ہے تو بس بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ندیم کے افسانے پچھلے آٹھ برس میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔ پہلے ان میں موضوع کو اہمیت حاصل تھی، اب موضوع سے زیادہ ایک واضح نقطہ نظر ہر چیز پر غالب ہے۔ فن کار نے یہ نقطہ نظر زمانہ کے سرد و گرم کو اچھی طرح چکھ کر اخذ

جبلّی کر اختیار کیا ہے اس لئے اس کے افسانے نہ صرف انسان کو انسانیت کی راہ دکھاتے ہیں بلکہ بڑی نرمی، خاموشی اور حلاوت کے ساتھ اس انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں جس کے بغیر زندگی میں وہ استواری اور ہمواری پیدا ہونی ناممکن ہے جو انسان کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے استحکام اور بقا کے لئے اشد ضروری ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر فن کا ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں جوں افسانہ نگار کا ربط ضبط زندگی کے ساتھ زیادہ ہوا ہے، جوں جوں اس کی شخصیت میں رچاؤ اور پختگی کے خصائص پیدا ہوئے ہیں اس کا فن بھی نکھرتا گیا ہے۔ احساس کی جو شدت اور جذبات کا جو خلوص اس میں ہمیشہ سے تھا اس میں نظر کی وسعت اور خیال کی بلندی سے ایک سکون اور ٹھیراؤ پیدا ہوا ہے - اور یہ سکون اور ٹھیراؤ فن کار کے فن کو متوازن بناتا اور فن کے مختلف عناصر پہ اس کی گرفت کو مضبوط کرتا ہے۔

سیاست، معیشت اور رومان —— زندگی کے ان تین پہلوؤں پر ندیم کی نظر ہمیشہ رہی ہے، سو اب بھی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت نے ان چیزوں کو پہلے اپنے رنگ میں نہیں رنگا تھا —— (یا اگر یہ سمجھا جائے کہ خارجی ماحول اور شخصیت کا یہ رچاؤ اپنے اختیار کی چیز نہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ جب تک شخصیت کے مختلف اجزا میں انتشار تھا اور پوری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی) ان تینوں پہلوؤں کے ذکر میں خارجی عناصر کا غلبہ تھا اور افسانہ نگار برابر مشاہدے کے تفصیلی بیان کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ اب وہ خارجی

زندگی سے زیادہ ان داخلی کیفیتوں کی مصوری کی طرف مائل ہے جو ایک طرف تو اسی خارجی زندگی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور دوسری طرف خارجی زندگی پر بہت گہرا اثر بھی ڈالتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے نئے دَور کے افسانوں میں (میں نے ندیم کے ان چند افسانوں کو ایک خاص دور کے افسانے اس لئے کہا ہے کہ ان میں افسانہ نگار کا فن بہت سے مدارج و منازل طے کر کے ایک ایسے مقام تک پہنچا ہے جو بہت سے نئے لکھنے والوں کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے) کرداروں کے خدوخال واقعات کے نقوش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیکھے، واضح اور نتیجہ خیز ہیں۔ ان کرداروں کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے پیچھے گزری ہوئی صدیوں کی روایت کا پس منظر بھی ہے اور حال کی زندگی کے پیدا کئے ہوئے تاثرات کا ردِ عمل بھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کی تشکیل ایسے گوناگوں عناصر سے ہوئی ہے جنہوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے منصب کو بوجوہ احسن پورا کرنے میں قدم قدم پر نمایاں حصہ لیا ہے۔ قاسمی افسانہ نگار ہونے کے علاوہ فطری طور پر شاعر، مفکر اور اصلاح پسند بھی ہیں اور دردمند انسان اور نڈر نقاد کی جملہ صفات کے حامل بھی ان کی شخصیت کی یہ گوناگونی، ہمہ گیری اور وسیع دامنی ان کے سارے افسانوں پر چھائی ہوئی ہے اور افسانے پڑھنے والا ہر آن یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے افسانے انسان کے جسم کو سیاست کی تعزیروں اور سماج کی زنجیروں سے رہائی دلانے کے بلند مقصد کی پیروی کرتے ہیں اور دل کی دنیا کی طرف سے بھی غافل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہے کہ مادہ

کی دنیا میں رہ کر بھی.... برابر دل کی دنیا سے زیادہ قریب رہنا ان کا مزاج ہے پھر ان دونوں کی حد بین روح اور اخلاق کی دنیا سے ملا کر نظامِ حیات کو انسان اور انسانیت کے معیار سے قریب لانا بھی ان افسانوں کا بنیادی مقصد و منصب ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور اس لئے ان کے فن (یعنی افسانہ) کی انفرادیت اس بات کی ہے کہ اس میں مادی اور روحانی زندگی کی بہترین قدروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو ان افسانوں پر شروع سے آخر تک مارکسی نظریوں کا گہرا اثر ہے اور دوسری طرف مذہبی اور اخلاقی رجحانات کا ہمدردانہ بلکہ بعض اوقات جذباتی عکس یہی رجحان ہے جس نے قاسمی کے افسانوں کو کبھی اخلاق کی ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اترنے دیا۔ جنس کو انسانی زندگی کا ایک اہم تقاضا سمجھنے کے باوجود وہ اس رجحان کو ہمیشہ حسنِ اخلاق کے معیار کا پابند رکھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان کی شخصیت میں احساس اور فکر دونوں دست بدست اور دوش بدوش ہو کر چلے ہیں۔ اور مادی رجحانات کی تیزی اور تندی نے برابر روحانی اور اخلاقی میلانات کی ہم نشینی میں اعتدال اور توازن کی شکل اختیار کی ہے یہاں تک کہ ایک ایسی منزل آئی ہے جہاں مصلح اور نقاد شاعر اور فن کار میں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔

اس تعریف و توصیف کے بعد (جو حقیقت میں تجزیہ اور تنقید کی غیر جانبدارانہ سعی ہے) شاید یہ سوال اور یہ مطالبہ غلط نہ ہو کہ یہ ساری باتیں اس مجموعہ کے آخر کن کن افسانوں میں ہیں۔ اس کا ایک بہت آسان سا جواب تو یہ ہو

سکتا ہے کہ ہر افسانہ ہیں، اس لئے کہ ہر افسانہ افسانہ نگار کے شخصی تاثرات کا سچا عکس اور آئینہ ہے لیکن یہ جواب یقیناً ہر افسانہ پر پوری طرح صادق نہیں آتا اس لئے کہ ہر افسانہ رئیس خانہ، گنڈاسا، کنجری، الحمدللہ اور آتش گل جیسا افسانہ نہیں۔ایک خصوصیت پڑھنے والوں کو ان پانچ افسانوں میں سے ہر ایک میں نظر آئے گی اور وہ یہ کہ ان سب میں ابتدا سے انتہا تک ہر حرف اور ہر خط افسانہ نگار کی پوری فنی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اپنی فنی تخلیق کو ہر پہلو سے حسن کا مرقع اور تاثیر کا مجسمہ بنانے کے لئے وہ ایک ایک پہلو کو سڈول اور ہموار بنانے میں خون جگر صرف کرتا ہے۔ ان مختلف حصوں میں علیحدہ علیحدہ حسن ترتیب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان مختلف حصوں میں باہمی توازن و تناسب قائم ہو۔ یہ توازن اور تناسب افسانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور قائم ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ مختلف منزلیں طے کرتا ہوا وہ خاتمہ تک پہنچتا اور مجموعی طور پر وہی گہرا تاثر پیدا کرتا ہے جو فن کار کا مقصود و مطلوب ہے۔

مجموعہ کے جن پانچ افسانوں کی طرف میں نے اشارہ کیا وہ فن کی پختہ کاری اور فن کار کی جگر کاوی کے بہترین مظہر ہونے کے علاوہ زندگی کے ایسے نقوش ہیں جنھیں سینکڑوں برس کے ماضی کی تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی روایت، حال کی سیاست اور معیشت اور اخلاق کے پیچیدہ مسائل اور ان مسائل میں الجھنے اور ان کا صید زبوں ہونے والے انسان نے اسی طرح مل جل کر بنایا ہے کہ زندگی اپنی ساری سمیت تلخی اور ناخوش گواری کے باوجود بڑی دل کش اور دل فریب

معلوم ہوتی ہے اور یہ بات صرف اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی کو اس کے نہاں خانوں میں گھس کر بے نقاب دیکھا اور اس کے حسن و عیب کو اپنی نظر کا چراغ بنایا ہے۔ زندگی پر اس کی نظر تیز بھی ہے اور گہری بھی۔ اس کے دل نے اس سے محبت بھی کی ہے اور نفرت بھی اور اسے دونوں رنگوں میں بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اس لئے اس نے اس کے اچھے اور برے کرداروں کے متعلق اور ان کرداروں کے احساسات، تخیلات جذبات اور افکار کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں مشاہدہ کی مہارت کے علاوہ، فن کارانہ حسنِ انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ سب کچھ دیکھ کر بھی سب کچھ کہہ دینے کی ہوس رکھنے کے بجائے نفسیاتی اجمال اور شاعرانہ ایجاز کو اظہار کا وسیلہ بنانا فن کی عظمت کی دلیل ہے اور اس عظمت کا اظہار پورے افسانوں کے مطالعہ کے علاوہ ان بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھی ہو سکتا ہے جو ان میں سے ہر افسانہ میں پڑھنے والے کو قدم قدم پر ملتے ہیں۔

" ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے ذرّے چھٹ کر انگلیوں میں چلے آئیں گے۔"

یہ گال "آتش گل" والی گلابو کے گال ہیں جن پر حالات کی ستم ظریفی نے غازہ کی سرخی چڑھا دی تو "اس کے چہرے کی سرسوں کو جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی نے چمکا دیا تھا۔"

یہ گلابو "آتش گل" کے ہیرو کو ایک ایسے زمانے میں ملتی ہے جب وہ شدید اعصابی بیماری میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر کے مشورے سے بے عملی کی خاموش زندگی

بسر کر رہا ہے۔ ماحول کے فرق نے اس کے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا ہے ایکا ایکی کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ یہ بیماری جیسے پھر لوٹ کر آجاتی ہے اور افسانہ نگار اس کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

"اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری شدید اعصابی بیماری پھر سے عود کر آئی ہے اور ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ بیماری ذہنی ہوتی ہے۔ آج وہ ڈاکٹر میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے کہتا" لاؤ مری دونوں جیبیں روپیوں سے ٹھونس دو، پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ یہ بیماری ذہنی ہے یا اقتصادی؟"

کتنی تلخی ہے اس سوال میں؟ لیکن کتنا سچا بھی ہے یہ سوال! افسانہ نگار یہ سوال کر کے ایک چابک دست فن کار کی طرح ہماری زندگی کے اس سارے نظام کی ابتری کو بے نقاب کر رہا ہے جس میں پیسہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ملتا کسی کو نہیں —— یا کم از کم جس کا حق ہے اسے نہیں ملتا اور حق دار کو اس کا حق نہ ملے تو زندگی کا اعصابی امراض میں مبتلا ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں بلکہ تقاضائے فطرت ہے۔

"رئیس خانہ" میں بہت سے کردار ہیں۔ ان میں سے ایک وہ "صاحب" ہے جو سکیسر پر ساون گزارنے آیا ہے اور جس کے "ماتھے کے ابھار کے نیچے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے"۔ اور دوسری مریاں ہے جس کی "بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر کاجل کی دھندلی سی لکیر آج پانچ چھ سال سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دھلی تھی" اور پھر اس کا شوہر گفتگو

ہے جو اپنے ایک بہت بڑے گناہ کا کفارہ صرف یہ کہہ کر ادا کرنا چاہتا ہے کہ "مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں۔"

"گنڈاسا" پنجاب کی دیہاتی زندگی کی کہانی ہے، جس کے شروع ہوتے ہی پڑھنے والا اس کی خالص مقامی فضا میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے:

"اکھاڑا جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی چوکیاں چن لی تھیں۔ "پڑ کوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ انہوں نے رنگین لنگوٹیں کس کر باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرّے بنا رہے تھے۔ وسیع میدان کے چاروں طرف گپیں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا ......"

یہ منظر کسی ایک موقع کی نہیں بلکہ صدیوں کی معاشرت اور روایت کا عکس ہے، جس میں مولا بھی پروان چڑھا ہے اور راجہ بھی ——— وہی مولا جس نے ڈھول کو پوروں سے چھو کر "یا علی" کا نعرہ لگانے کے لئے ہوا میں ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے یہ اطلاع دی "مولے! اے مولے بیٹے تیرا باپ قتل ہو گیا۔" اس خبر سے "پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رُک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے

پھننے لگے، ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی، اور پھر بھگدڑ مچ گئی" اور پھر:

"مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا"

یہی مولا تھا جس نے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے کر بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک اپنے باپ کے قاتل کی نسل کو ختم نہ کر دے گا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ اور اس لئے اپنے صبح و شام اس انتظار میں کاٹ رہا تھا کہ رنگے کا چھوٹا بیٹا گلا آئے تو انتقام کی آگ سرد ہو۔ لیکن ایک دن رنگے کی منگیتر 'راجو' اس کے آدرش کے راستے میں حائل ہو گئی اور اس طرح کہ جب وہ ایک دن اس کے گھر گھی بیچنے آئی اور مولا کی ماں ترازو دینے اندر چلی گئی تو مولا نے دیکھا کہ:-

"راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کر لیں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں ابھرا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے، انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں۔ اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی

ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا
جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان
کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے، یا اسے اپنی ہتھیلی
پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا —"

اور پھر جب اچانک ایک دن گلا گاؤں میں آ گیا اور تڑاخ سے مولا کے منہ پر ایک چانٹا مارا تو اس نے اپنا وہ گنڈاسا نہیں اٹھایا جو دنوں سے گلے کے خون سے پیاس بجھانے کے لئے بیتاب تھا — اور جب اس کی ماں نے یہ خبر سن کر اپنا سر پیٹ لیا تو وہ رونے لگا اور ماں کے یہ کہنے پر کہ "تو تو رو رہا ہے مولے!" لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولا "تو کیا اب رووں بھی نہیں؟"

الحمد للہ کے ہیرو مولوی ابل کے شادی سے پہلے بڑے ٹھاٹ تھے —
"کھدّیا لٹھے کی تہ بند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ، جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس میں جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے ہوتے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں

لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں......"

لیکن جب مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی جگہ گھٹنے لگی اور ضروریات زندگی گھٹنے کی بجائے بڑھتی رہیں تو اُن کی بیوی زیب النسا کے کنگن جو کبھی اس کی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے ذرا سے جھٹکے میں نیچے گرنے لگے اور

"اس کی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن گیا تھا اور جب وہ پلکیں جھپکتی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی"۔

اور جب یہ حالت معمول بن گئی اور ایک دن بیوی نے کہیں سے دس روپے قرض لانے کا مشورہ دیا تو مولوی اُبل بولے کہ بھلا کون آنکھ کا اندھا مجھے قرض دے گا، میری حالت سب جانتے ہیں اس لئے کہ :

"سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں"

.. یہی مولوی اُبل اپنے بہت بڑے محسن چوہدری فتح داد کے مرنے پر اس لئے بیوی کو مبارکباد دینے آئے ہیں کہ دس کی جگہ بیس کا انتظام ہو گیا —— بیوی نے یہ خبر سُنی تو اس زور سے اپنی چھاتی پہ دوہتڑ مارا کہ بچے تک بلک کر رو دیئے ——"

"اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی اُبل کو گردن سے دبوچ

> گیا ہے ...... مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا۔"

یہ چند مثالیں ہیں جن میں افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے فن کی ہلکی ہلکی سی جھلکیاں ہیں، اس کا دوربین مشاہدہ جو حال کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقع ہیں، اور کرداروں کے چشم و لب کی ہلکی سے ہلکی جنبش میں بھی صدیوں کی روایات کے آثار دیکھ لینے پر قادر ہے۔ اس کا دردمند دل جو ہر روتی ہوئی آنکھ کے آنسوؤں اور کراہتے ہوئے لب کی آہوں کو اپنا سرمایہ جانتا ہے۔ اس کی انسان دوستی، اس کی اصلاح پسندی، اس کی تلخ اور بے باک نکتہ چینی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی شیریں نوائی، اظہارِ بیان میں شعریت، اور اپنی فنی تخلیق کے مختلف اجزا میں آہنگ، توازن اور حسنِ ترتیب —— تمہید کی کشش اور خاتمہ کا تاثر، یہ سب چیزیں ان مثالوں میں کم کم اور مکمل افسانوں میں اس سے بہت زیادہ زیادہ ہر پڑھنے والے کے سامنے آئیں گی، اس لئے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانے جسم یا مادہ کی دنیا اور اخلاق اور روح کی دنیا کی بہترین قدروں سے حامل ہونے کے باوجود صرف ایک محدود طبقہ کے لئے دلچسپی اور تاثیر کا سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ ان میں خواص اور عوام دونوں کے لئے یکساں دلچسپی بھی ہے اور تاثیر بھی اس لئے کہ دونوں اپنے

مزاج اور مذاق کے اختلاف کے باوجود انسان ہیں، اور دل سے نکلی ہوئی ہر بات دونوں کے دل میں گھر کرتی ہے ——

پھر اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی بڑی صاف اور صریح ہے کہ یہ افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس قبائے گل پر کسی مزید گل کاری کی کوشش تکلفِ محض ہے

دستار عظیم
۱۶ر نومبر ۶۲ء

بڑی سرکار کے نام

نجیب اس وقت شیخ چلی کے تازہ ترین لطیفوں کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جو دکان اس کے دشمن کے نام الاٹ ہو گئی تھی وہی اب اس کے نام الاٹ کر دی گئی تھی اس لئے صبح سے اس نے شیخ چلی کے لطیفے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا تھا۔

وہ ایک لطیفہ پڑھنے کے بعد قہقہے کے لئے اپنا جبڑا کھولنے ہی والا تھا کہ وہ اندر آئی اور حسب معمول نہایت بے رحمی سے اپنے ننھے کی ناک پونچھتے ہوئے بولی "آج تو اکھڑ دو بھیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ جینا مشکل ہو گیا ہے۔"

آج وہ بڑے عاشقانہ موڈ میں تھا۔ اور پھر پڑوس میں رہنے والی اس جوان عورت نے کئی بار چکی پیسنے میں اس کی امی کا ہاتھ بٹایا تھا، ویسے تھی بھی گوارا یعنی اگر غریب نہ ہوتی تو خاصی ہوتی۔ اور آج تو وہ اسے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ دراصل آج وہ اسے میلے کپڑوں اور بکھرے الجھے بالوں سے الگ کر کے دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے ہر چیز کو میل اور الجھاؤ سے الگ کر کے دیکھا تھا۔ اور پھر یہ

عورت ہفتے بھر سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اسے کوئی بہت ضروری خط لکھوانا تھا۔ ایک بڑا سا کاغذ لے کر وہ بولا "بیٹھ جاؤ"۔

عورت نے سامنے کے کھٹولے پر بیٹھتے ہوئے دعاؤں کا ایک تانتا باندھ دیا۔ اور بچے کو کمر سے اتار کر یوں ایک طرف ڈال دیا، جیسے اس نے اب تک چیتھڑوں کی ایک گٹھری اٹھا رکھی تھی۔ بچہ اپنے ذرا ذرا سے میلے ہاتھوں سے بان کو نوچنے لگا اور وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اس کے چہرے کے خطوط تن گئے اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بھنچ گئی۔ "پاکستان کی بڑی سرکار صاحب کو لکھنا ہے"۔

نجیب نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ شیخ چلی کے لطیفے چھوڑ کر اس نے خواہ مخواہ ایک بے کار کام اپنے ذمے لے لیا ہے مگر عورت کی مٹھی اسی طرح بھنچی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں سے جیسے پتلیاں غائب ہو گئی تھیں۔

کھلے کھلے بان میں اپنی ٹانگیں پھنسا کر بچہ بلکنے لگا۔ عورت نے پہلے تو بچے کی پیٹھ پر ایک دھموکا جڑا اور پھر اسے نہایت بے رحمی سے اوپر کھینچ کر وہیں پٹخ دیا۔ بچے کی سانولی پنڈلیوں پر لالی کھنڈ گئی۔ کئی جگہ سے خون پھوٹ نکلا۔ "کتے کا پلا!" وہ گرجی۔ "مر نہ گیا وہاں دلی میں میرے پھوٹے بھاگوں کی طرح موا میرے ساتھ چمٹا چلا آیا۔"

بچہ نچلے ہونٹ کو لٹکا کر ماں کی پشیمانی کا انتظار کرنے لگا کہ وہ چوم لے تو یہ رو دے۔ مگر وہ نجیب کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ بچے نے مایوس ہو کر لٹکا ہوا ہونٹ اوپر اٹھا لیا اور بان کو نوچنے لگا۔

وہ بولی "تو بھئی ذرا صاف صاف لکھنا کہ صاحب جی پڑھ لیں۔ لکھو کہ جب حضور کا پاکستان بنا ہے تو میں دلّی میں تھی۔ میاں کسی صاحب کا بیرہ تھا۔ میں ایک بڑے گھر میں برتن صاف کرتی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ تین لڑکے تھے۔ بڑے پیارے سے، گورے گورے سے۔ ایک بار تو ایک نئی نئی پڑوسن نے میرے آنگن میں جھانک کر کہہ دیا تھا "یہ صاحب کے بچے ہیں بہن!" — وہ رک گئی اور ننھے کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ اسے چوما۔ اس کی پنڈلیوں کو سہلایا اور پھر نہایت بے رحمی سے اس کی ناک پونچھتے ہوئے بولی "یہ بھی کبھی گورا تھا بھیّا۔ رفیوجی کیمپ میں کالکھ پتھر گئی۔"

دکان کی نئی نئی الاٹمنٹ نے اسے بہت عظیم الفرصت بنا دیا تھا۔ اور پھر ابھی شیخ چلّی کے لطیفوں کی آدھی کتاب باقی تھی۔ اس نے ناگواری سے کہا "اچھا تو تمہارے تین بچے تھے۔"

اس نے پھر سے بچے کو پرے پٹخ دیا۔ اب کے وہ اِدھر اُدھر دائیں بائیں آدھا لٹک کر رونے لگا۔ پھر کر اس نے بچے کو زور سے اوپر کھینچا اور نیچے فرش پر جیسے پھینک دیا۔ بچے نے کچھ دیر تک نچلا ہونٹ لٹکائے رکھا اور پھر مایوس ہو کر اوپر اٹھا لیا۔ پھر وہ دو ہاتھوں اور ایک گھٹنے کے بل گھسٹتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا عورت نے بچے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتی ہوئی کچھ سوچتی رہی۔

نجیب نے لطیفوں کی کتاب کو اٹھا کر پھر اسی طرح رکھ دیا۔ ایک پاؤں کو کھینچ کر پھر سے پھیلا دیا۔ تنگ آ کر وہ بولا "آگے کیا لکھوں؟"

عورت نے ناخن کے کٹے ٹکڑے تھوکتے ہوئے کہا۔ "لکھو کہ اس کے بعد بڑا غضب ٹوٹا۔ ایک دن میرا میاں دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے اسے چھرے سے پھاڑ کر رکھ دیا۔ میں اس وقت ننھے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اسے سینے سے چمٹائے باہر بھاگی تو ادھر سے اکٹھے دس بارہ آدمی مجھ پر جھپٹے اور میں دوڑی۔ میں اپنے میاں کی لاش پر سے پھاند گئی۔ اور اس کے ایک ہندو دوست کے گھر میں گھس گئی۔ اس نے مجھے رسوئی میں چھپا دیا۔ باہر بڑا شور ہوتا رہا۔ پھر جب شام ہوئی تو وہ ایک ہاتھ میں چوربتی اور دوسرے میں چھرا لئے مجھے باہر لے آیا۔ اور بتایا کہ شہر بھر میں مسلمانوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ اور فوج اکا دکا بچے کھچے مسلمانوں کو پرانے قلعے میں جمع کر رہی ہے۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ گھر سے ضروری سامان لے کر پرانے قلعے چلی جاؤں اور پھر وہاں سے پاکستان کی راہ لوں۔ میں اس کے ساتھ ویران گلیوں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف آئی تو میرے میاں کی لاش وہیں پڑی ہوئی تھی۔ بس پہلے سیدھی تھی اور اب الٹی۔ آنگن میں آئی اور میاں کے ہندو دوست نے چوربتی جلائی تو میرے دونوں بچے آنگنے سامنے انتڑیوں کے ڈھیر لگائے پڑے تھے اور گھر لٹ چکا تھا!"

نجیب ہنسی نہ ضبط کر سکا۔ "تم نے تو ایک لطیفہ کہہ دیا۔" اس نے قلم کو ایک طرف رکھ کر تالی بجائی۔ "بچے اپنے سامنے انتڑیوں کے ڈھیر لگاتے پڑے تھے! واہ! موت کو بھی لطیفہ بنا دینا کوئی تم دلی والوں سے سیکھے۔ میں نے غدر کے لطیفے بھی پڑھے ہیں۔ واہ وا" —— اور وہ قلم اٹھا کر کاغذ پر جھک گیا۔

عورت کا چہرہ فق تھا۔ اس کے نیم وا ہونٹ جو اکھی کا دہانہ معلوم ہوتے

تھے، اور اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ وہ نجیب کو اپنی ویران صحرائی آنکھوں سے گھورے جا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "تم یہیں کے رہنے والے ہو نا۔ اس لئے اسی لئے تمہیں بچوں کے پھٹے ہوئے پیٹ سے ابل کر نکلی ہوئی انتڑیاں لطیفہ لگتی ہیں اور ———"

مگر نجیب کو تو نئی دکان الاٹ ہوئی تھی اور وہ بھی دشمن سے چھین کر ——— وہ قلم کو انگلیوں میں گھما کر بولا "اچھا تو گھر لٹ چکا تھا!"

"وہ ہندو مجھے ریفوجی کیمپ میں چھوڑ آیا۔" وہ اب ایک مشین کی طرح بول رہی تھی۔ "پھر تین مہینے کے بعد میں دوسرے لٹے پٹوں کے ساتھ یہاں حضور کے دیس میں لائی گئی۔ والٹن اسٹیشن پر اتری تو پہلے قبروں میں سے گزرنا پڑا، یہ کچھ عجیب سا شگون تھا کہ جہاں ہم جینے آئے ہیں وہاں بسم اللہ قبروں سے ہو رہی ہے۔ میرا ننھا ٹھنکا پر مجھے تو اپنے ننھے کے لئے جینا تھا۔" وہ اچانک رک گئی اور ادھر ادھر دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ننھا کہاں گیا؟" اس نے نجیب سے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئی۔

نجیب نے شیخ چلی کے لطیفوں کی کتاب اٹھائی۔ باہر سے چند زبردست دھموکوں کی آواز آئی۔ عورت نے اندر آ کر بچے کو فرش پر چیتھڑوں کی گٹھری کی طرح پٹخ دیا اور بولی "کیچڑ کھا رہا تھا مُوا کتے کا پلا" جھک کر اس نے بچے کے گال پر ایک زور کا طمانچہ مارا۔ اور بچہ اپنے کیچڑ بھرے ہاتھ سے گال کو ڈھانپ کر ماں کو کچھ اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہے "تو کیا اب کیچڑ بھی نہ کھاؤں؟" ——— اب کے اس نے ہونٹ بھی نہیں لٹکایا۔ بس ایک ناقابلِ فہم حیرانی سے ماں کو گھورتا رہا۔ اس کی

ویران صحرائی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے صرف ایک ننھا سا سوال تھا یہ تو کیا اب کیچڑ بھی ——"

عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا اور چیخنے لگی "لکھو کہ بڑے سرکار جی صاحب، مجھ نگوڑ ماری کو تو یہاں اتنی سی پناہ بھی نہ ملی جتنی اس ہندو کی رسوئی نے دی تھی۔ مجھ جنم جنم کی بدنصیب کو یہاں چند دور کے رشتہ داروں کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ اور رشتہ دار مجھے یہاں چھوڑ کر کسی اور ضلع میں چلے گئے۔ میں نے یہاں چکی پیسی پر بدلے میں چپہ چٹکی بھر آٹا پایا۔ اس سے دو جانوں کے دوزخ کیسے بھرتے۔ پھر میں نے ایک فقیر کی قبر ڈھونڈھی اور وہاں جھاڑو دینے لگی۔ پر دو دن کے بعد اصلی مجاور آگیا اور اس نے —— اس کم بخت نے مجھے دھکا دے دیا اور میرے بچے کو جو یوں گیند کی طرح اچھالا تو وہ ایک دھنسی ہوئی قبر میں جا گرا —— موئے سب کے سب پیارے مریں، جہنم میں جلے اللہ کرے"

"بکومت" نجیب نے نہایت غصے سے چلاتی ہوئی عورت کی طرف دیکھا، جس کی ایک مٹھی سختی سے بھینچی ہوئی تھی، اور آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب ہو گئی تھیں۔ اور سارے جسم میں رعشہ بھر گیا تھا۔ نجیب نے جل کر کہا "آہستہ آہستہ بولو۔ کان کھائے لیتی ہے، وقت الگ ضائع کیا اور دماغ الگ چاٹا۔ بتاؤ اور کیا لکھنا ہے"

"بس اب تو تھوڑا سا لکھنا ہے" وہ بولی "بس اب تو یہی لکھنا ہے کہ میں نے نمبردار سے فریاد کی پر وہ ہرنوں کے شکار پہ جا رہے تھے، پوری بات نہ سن سکے۔ پھر میں نے بڑے افسروں کی منت کرنا چاہی، پر میں تو ان کے دروازوں

پرورش تک بھی نہ دے سکی۔ بھیک مانگنے کا یارا نہیں۔ میری سات پشتیں اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتی رہی ہیں، اب میں جنم جلی ان کی آن کو بٹہ کیوں لگاؤں"—— یہاں سے عورت کی آواز پھر سے تیز ہونے لگی: "اور صاحب جی اب صرف یہ کہنا ہے کہ کبھی آپ ہی ادھر اس قصبے میں آیئے تو آپ سے اور کچھ نہیں صرف یہ پوچھوں گی کہ کیا آپ کے پاس میرے لئے اور اس بے زبان کے لئے ایک ہنڈ کی رسوئی بھی نہیں۔ جب آزادی ملی ہے تو میں نے اس پر کلیجے کے ٹکڑے چڑھائے ہیں۔ میں نے تو لیگی پڑوسنوں سے سنا تھا کہ آزادی ملے گی تو ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے کچھ نہ کچھ سکے گا، پر اب تو میں جس کو مدد کے لئے کہتی ہوں یہی ٹکا سا جواب ملتا ہے "میں کیا کر سکتا ہوں" —— تو پھر بڑی سرکار جی صاحب اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں، اگر حضور نے میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں اس ننھے کو گھسیٹتی ہوئی پیدل کراچی پہنچوں گی اور کہیں نہ کہیں آپ کی موٹر روک کر پوچھوں گی —— میں پوچھوں گی ——"

"کیا پوچھو گی؟" نجیب جس کا قلم عورت کی تیزیٔ گفتار کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ کچھ ایسے غصے سے بولا جیسے پاکستان کی بڑی سرکار صاحب وہی ہے۔

عورت کی مٹھی کچھ یوں بھنچ گئی تھی جیسے انگلیاں ہتھیلی سے پار نکل جائیں گی۔ اور اس کی گردن اور کنپٹیوں پر بہت سی رگیں ابھر آئی تھیں اور ننھا اس کا گریبان جکڑے اسے اپنی ویران صحرائی آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔

"کیا پوچھو گی تم؟" نجیب نے قلم میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں پوچھوں گی" عورت جیسے کسی خطرناک سازش کا حال بتا رہی تھی۔ "میں

پوچھوں گی کہ حضور آپ کو جو آزادی ملی تھی اس میں سے میرا حصہ بھی تو لایئے "۔

"یہ میں نہیں لکھوں گا" نجیب نے میز کو پاؤں سے پرے دھکیل دیا! ور شیخ چلی کے تازہ ترین لطیفے اٹھاتے ہوئے بولا "میں نے کونسا گناہ کیا ہے کہ تمہارے ساتھ میں بھی دھر لیا جاؤں۔ تم نے اب تک جو کچھ لکھوایا ہے یہی تمہاری عمر قید کے لئے کافی ہے!"

"ارے! عورت کی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی" "تو بھیا، تم پہلے سے بتا دیتے کہ ایسی چٹھی لکھنے سے قید ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھ نگوڑ ماری کو کیا معلوم"۔

وہ آگے بڑھی، چٹھی اٹھا کر اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔ بچے کو ایک ہاتھ سے کھینچ کر گود لے پر جمایا اور جاتے ہوئے بولی "میں جنم جلی تو سمجھی تھی یہاں اپنا دکھ درد کہنے کی آزادی ہے"۔

رئیس خانہ

خاکستری رنگ کے پتھروں کی اس عمارت کو بڑے لوگ مسافر خانہ اور چھوٹے لوگ رئیس خانہ کہتے تھے، شاید اس لئے کہ بڑے لوگوں کے لئے ڈاک بنگلہ موجود تھا اور چھوٹے لوگ سرائے میں ٹھہرتے تھے، جہاں صبح اور شام کو وہ بھٹیارے کے پاس تنور کے ارد گرد بیٹھ کر موٹی موٹی روٹیوں پر دال کی ڈھیریاں لگا کر کھاتے، رئیس خانے کے چوکیدار کی بیوی مریاں اور ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بشنو کے حسن کا مقابلہ کرتے اور چٹخارے بھرتے، اور لگے ہاتھوں ایک نظر بھٹیارے کی بیوی پر بھی دوڑا لیتے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی ریاست کی رانی ہے اور بھیس بدل کر بھٹیارن بنی پھرتی ہے —— اور ادھر رئیس خانے کا یہ عالم تھا کہ وہاں رئیس آتے ہی نہ تھے، لے دے کے کبھی کبھار شکاری نوجوانوں کی کوئی ٹولی ہرنوں کی تلاش میں یہاں آنکلتی تو رئیس خانے میں رک جاتی، اس روز فضلو چوکیدار بڑی امید و دل سے چھت کے جالے اتارتا، برآمدے کے گوشوں میں پڑی ہوئی دھول اڑا دیتا ورکو باہر پھینکتا اور اکلوتے گل دان کے بدبودار پانی

اور جلے ہوئے پھولوں کو گرا کر ڈاک بنگلے کے مالی سے نئے پھول مانگ لاتا۔ اور جب شکاری رخصت ہو جاتے تو فضلو کو دوسری عمارتوں کے سب چوکیدار پولے ورجے کے جھوٹے اور مکار نظر آنے لگتے جو اُسے بڑی بڑی بخششوں" کے قصے سناتے اور بتاتے کہ جتنے روز وہ صاحب ان کے ہاں رکے ہیں انہوں نے پلاؤ، فیرنی اور قورمے کے سوا اور کوئی چیز چکھی ہو تو ان کی زبان پہ پھوڑا نکلے۔ فضلو مریاں سے ان چوکیداروں کی لافوں کا ذکر کرتا تو وہ کہتی "ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ ان کی بیویوں بیٹیوں کو کبھی دیکھا ہے تم نے؟ ایسا ریشم پہنتی ہیں نہ بالکل پٹیالے کی رانیاں معلوم ہوتی ہیں، فاطمہ چوکیدارن آج چشمے پہ کپڑے دھونے آئی تھی، میں نے کہا، فاطمہ، شرم نہیں آتی، ننگے سر چشمے پر چلی آتیں! پہلے تو وہ زور سے ہنسی، پھر مجھے پاس بلا کر بولی "اور تمہیں شرم نہیں آتی کہ میں نے سو روپے کا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے اور تم مجھے ننگے سر دیکھ رہی ہو! اور میں نے غور سے دیکھا تو فضلو، اس نے ایسا مہین دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا کہ مکڑی کا جالا کیا چیز ہے۔ وہ بچھو کی سی مونچھوں والا ایک صاحب آیا تھا نا جس کی بیوی بچوں کی جگہ کتے پالتی تھی، وہی دلوا گیا اپنی بیوی سے، اور یہاں ہمارے صاحب ریئس خانے کی صابن دانی ہی چرا لے گئے۔ اور وہ شکاری رئیس شیرو کو ایک چونی دے گئے تھے کٹے ہوئے کنارے والی، حرامزادے"

"سؤر کے بچے!" فضلو مریاں کی تائید کرتا۔

یہ ریئس خانہ کوہستانِ نمک کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پہ تھا، سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھند میں لپٹا پڑا رہتا، دور سے یوں نظر آتا جیسے کوئی بڈھا

مہینوں سے نہیں نہایا۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر اُلّو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں، بنگلوں کے پہلو کی کوٹھریوں میں چوکیدار اور اُن کے بیوی بچے دوپہر تک کھاٹوں کھٹولوں پہ پڑے سکڑا کرتے، اور پھر دھوپ کی ڈھنڈیا پڑی رہتی۔ لیکن جونہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی۔ جب نیچے وادی سے ہریالی کی دمک بلندی پر آتی، اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی، اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پہ آگ لگا دیتا۔ اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے، تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی، چوکیداروں کی بیویاں اور بچے جالے اتارتے اور شیشے دھوتے، مالی باغیچوں میں سے خزاں کا ملبہ اٹھاتے اور قسم قسم کی پنیری لگاتے، دکاندار میدانوں کو چھوڑ کر خچروں پر دکانوں کا سامان لادے اوپر آ جاتے، شام ہوتے ہی بنگلوں کے پہلو میں دبکی ہوئی کوٹھریوں کی کھڑکیاں جاگ اٹھتیں اور ہر طرف عید رات کی سی ہماہمی طاری ہو جاتی۔

اور پھر بڑے بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے خاندان لمبی لمبی موٹروں میں بھرے ہوئے سکیسر کی چکراتی ہوئی سڑک پر تیرتے ہوئے آتے، چوکیداروں اور مالیوں کے بچے موٹروں کے شیشوں میں سے امیر لوگوں کے گورے گورے بچوں کو دیکھتے تو اُن کے پیچھے بھاگتے اور جب موٹر کسی بنگلے میں چلی جاتی تو وہ گیٹ سے لگ کر منہ کھولے کھڑے ہو جاتے۔ اور جب امیر بچے کاروں سے

اترتے اور اتفاق سے ان کی نظر گیٹ کی طرف اُٹھ جاتی تو چند جبری قسم کے غریب بچے فوراً سلام کرتے، اُدھر سے سلام کا جواب مل جاتا تو وہ شرمیلے اور بزدل بچوں کی طرف فخر سے دیکھتے اور کہتے "دیکھا، ہمیں سلام کا جواب ملا ہے۔ اب ہمیں بلّے اور گیندیں اور پرانے بوٹ ملیں گے انعام میں۔ اور تم بیٹھے دیکھا کرنا، سورو، بڑے آدمیوں کو جھک کر سلام کرنا چاہیے۔ بڑا ثواب ملتا ہے"۔

افسروں کے بعد ڈاک بنگلے میں قسم قسم کے صاحب آتے، چند روز کے لئے رکتے اور پھر چوکیدار اور مالی میں بخشیش بانٹتے میدانوں میں اتر جاتے، چند لوگ عالی جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو سلام کرنے کا فخر حاصل کرنے آتے، چند اپنی جاگیروں کے مقدمات کے سلسلے میں، چند گھی کے کنستر، انڈوں کی ٹوکریاں اور بٹیروں کے پنجرے ڈالی کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں —— ان میں سے بہت ہی کم تعداد ایسے صاحبوں کی ہوتی جو محض سکیسر کو دیکھنے آتے، کبھی کبھی جوگیوں کی ٹولیاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سکیسر کی گھاٹیوں میں رینگتی ہوئی اوپر آتیں اور رات سرائے میں ٹھہر کر صبح کو پہاڑ کی دوسری طرف اتر جاتیں، یا نوجوان شکاری ہرنوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے سکیسر کے قریب پہنچتے تو دور سے چمکتے ہوئے بنگلوں اور چمنیوں سے نکلتی ہوئی نیلے دھوئیں کی دھاریاں دیکھ کر اوپر آجاتے، یہاں وہ رات ریسٹ خانے میں گزارتے اور چوکیدار کی آنکھ بچا کر منہ اندھیرے ہی نیچے اتر جاتے۔

"سور کے بچے" فضلو ان صاحبوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا۔

"حرام زادے" مریاں ان کے بارے میں رائے ظاہر کرتی۔

ایسے ہی شکاریوں میں سے کسی نے چپکے سے کھسکتے وقت رئیس خانے کی صابن دانی بھی اپنے تھیلے میں رکھ لینا مناسب سمجھا۔ اسی لئے نفتلو اور بے تحاشہ حقہ پیتا، مریاں اس کے پاس بیٹھی "ابابیلی" پر سوت چڑھاتی یا شیرو کے سر سے جوئیں چنتی اور ہر جول پر اُسے "حرامزادہ" کہتی۔

سکیسر کے شرق میں پھیلی ہوئی وادی کو "سون" کہتے ہیں۔ یہاں کے دیہات میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پہ جنم لیتا ہے، اور پھر وہاں سے اتر کر سون کے سبزہ زاروں پہ برستا ہے۔ سون والوں کی نظریں بارش کے انتظار میں بجائے آسمان کے سکیسر کی طرف اٹھتیں۔ چھٹی پہ آئے ہوئے فوجی جوان دوربینیں لگاتے، چمکتے ہوئے سفید بنگلے قریب آجاتے، گھنے درختوں کے جھرمٹوں میں کبھی کبھی کوئی کار رینگتی دکھائی دے جاتی۔ لیکن انہیں تو چوٹی کے آس پاس کہرے کی اس دھجی کی تلاش ہوتی جو عموماً رات کی رات پھیل کر بادل بن جاتی تھی اور پھر سکیسر کی بلندیوں کو دھو کر پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے دیہات کا رُخ کرتی تھی۔ جو سکیسر پر سے کچھ یوں نظر آتے تھے جیسے ذرا سی ٹھوکر سے سارا گاؤں ڈھلان پر سے پھسلتا ہوا میدان میں آرہے گا۔

لیکن اب کے ساون نے سکیسر کی چوٹی کے بجائے سون کے ایک گاؤں پر جنم لیا، سکیسر والے نیچے وادی میں اور پہاڑیوں کے افق تک پھیلتے ہوئے طویل سلسلوں پہ پانی برستا دیکھتے رہے۔ اور سکیسر کے حصے میں صرف نم آلود ہوائیں آئیں، جنوب اور مغرب میں خوشاب اور میانوالی کے چٹیل

میدانوں سے لُو کے طوفان اٹھتے، ادھر شمال اور مشرق میں پکھڑ اور سون کی ڈھلی ہوئی گھاٹیوں میں سے خنکی ٹپکتی اور سکیسر کے بنگلوں کے پردوں کو ایک پُر اسرار ہوا چھیڑتی جو کبھی گرم ہوتی، کبھی ٹھنڈی اور کبھی محض مرطوب۔ اور بڑے لوگ بلندیوں پر دوربینیں لگائے نیچے وادی پر بدلیوں کی دوڑیں دیکھتے، وادی کے حاشیے کی پہاڑیوں کا پانی چاندی کی چادریں بن کر جھیل کی طرف بڑھتا، ٹینس کے میدان میں بڑے لوگ کھیل بند کر کے سگرٹ پھونکتے اور جمائیاں لیتے اور جب وادی سے کوئی تیز جھونکا بھیگی ہوئی دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو کو اوپر سکیسر کی طرف اچھال دیتا تو وہ انگڑائیاں لے لے کر ٹیلیفونوں کی طرف عجیب بے بسی سے دیکھتے جیسے ساون قانون کی زد میں آسکتا تو اسی وقت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نظر آتا۔

ان دنوں سکیسر کے ڈاک بنگلے میں ایک شخص قیام پذیر تھا، نہ وہ کسی افسر کو ڈالی دینے آیا تھا اور نہ اس کا کوئی مقدمہ تھا، وہ سکیسر پر ساون گزارنے آیا تھا۔ اور ساون کی اس شرارت سے بہت اداس تھا کہ سون میں ندیاں بہہ رہی ہیں اور سکیسر کے چشمے تک خشک ہو چلے ہیں، برسوں سے ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا تھا۔ اس لئے وہ ساون شروع ہونے سے چند روز پہلے ڈاک بنگلے میں آگیا۔ اور اب ساون کی ساتویں تاریخ تھی لیکن بارشیں نیچے نوشہرہ، انگہ اور اوچھالی کے دیہات میں ہو رہی تھیں اور یہاں سکیسر کے درختوں پر ہلکی ہلکی گرد جم رہی تھی۔ اور یہاں کے رہنے والوں کی آنکھوں میں پیاس کی ویرانی بس گئی تھی۔ وہ شخص دن بھر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا اور سگریٹ پیتا، شام کو وہ ٹینس کے میدان کے قریب سے گزرتا ہوا کھلاڑیوں سے بالکل

بے نیاز آگے بڑھ جاتا۔ رئیس خانے کے پہلو والی سڑک سے ہوتا ہوا نیچے اُترتا، کچھ دیر کے بعد واپس آتا اور پھر ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی اور دو روشندان بہت رات گئے تک چمکتے رہتے۔

فضلو کو ڈاک بنگلے کے مالی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ صاحب پچھلے سال بھی یہاں ساون گزارنے آیا تھا، پھر ایک دن اس نے ڈاک بنگلے کی عمارت کی بہت مذمت کی اور کہا کہ رئیس خانے کی عمارت کا جواب سارے سکیسر میں نہیں۔ ایسا دلکشا مقام تینوں ڈپٹی کمشنروں کی کوٹھیوں کو بھی میسّر نہیں آیا، اور مالی نے صاحب کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ رئیس خانے کی عمارت ڈراؤنی حد تک بےرونق تھی، اس کی پشت پر جو پہاڑی تھی اس نے مغرب کا سارا منظر چھپا رکھا تھا۔ اور اس کے مختصر سے صحن کے کنارے پر درخت اتنے گنجان تھے کہ نیچے وادی میں جھیل بھی جھکی ہوئی شاخوں میں سے بہت سے ستارے بن کر ہی جھلک پاتی تھی۔ دو سال سے یہ بات بھی مشہور ہو چلی تھی کہ رئیس خانے میں بھوت بسنے لگے ہیں، مالی کو صاحب کی بد مذاقی پر بہت افسوس ہوا تھا۔

"پھر وہ چلا گیا" مالی نے کہا،

"ساون گزار کر یا پہلے ہی" فضلو کو دلچسپی ہو رہی تھی کیونکہ ایک مدت کے بعد کسی صاحب کے سلسلے میں اسے رئیس خانے کا نام سُنائی دے رہا تھا۔

مالی بولا "یہ تو یاد نہیں بس وہی دن تھے جب تم ساس کی موت پر مریاں کو ساتھ لئے نیچے وادی میں اُترے تھے، ایک دن تم گئے، دوسرے دن صاحب نے پوری کار کرائے پر لی اور چلا گیا، اور مجھے سو روپے بخشش دے گیا۔"

"سو روپے!" فضلو کی حالت غیر ہونے لگی۔ "پر یہ ہے کون؟"

"کوئی بھی ہو" مالی نے بے پروائی سے کہا "ہمیں اس سے کیا مطلب بخشش سے ہے، سو وہ ملی۔ سوچو تو، ایک سو روپے، معمولی رقم نہیں، منہ میں سماتی ہے ہاتھ میں ایک ہی بار نہیں اٹھائی جا سکتی۔"

فضلو کی بھویں جڑ گئیں اور ماتھے پر ایک قوسی شکن ابھر آئی، "ایک سو!" اس نے کہا "ہوش میں تو ہو؟"

"ارے بھئی ہاں —— ہزار بار ہاں —— پورے ایک سو —— پانچ بیسیاں —— چار پچیسیاں —— اور پھر اتنا گرم اور نرم کمبل کہ ہاتھ لگاؤ تو جانو تازہ حلوہ چھو رہے ہو —— یہ کمبل اس نے بہشتو کو دیا، اور بہشتو کا کام یہ تھا کہ وہ تین دن اس کے کمرے کے گلدان سجائے اور ایک بار تولیہ دھو دیا —— بس —— کوئی اللہ والا ہے!"

فضلو بخششوں کا ذکر سن کر چڑ جانے کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر جب مالی نے پہلے قرآن مجید کی اور پھر اپنی بیوہ بہن بہشتو کی قسم کھائی تو وہ کوئی غیر مرئی ساگولا نگل کر واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا، اور مریاں کو اس واقعے کا ذکر یوں سنایا جیسے مالی نے اس کے ہاتھ مریاں ہی کے لیے ساری تفصیل بھجوائی ہے۔ مریاں نے لسی کے پیالے میں نمک کی چٹکی گھولتے ہوئے کہا "میں تم سے پوچھتی ہوں فضلو، کو جب ریسٹ خانے کی چوکیداری میں ہمیں اڑتی دھول بھی نہیں ملتی تو یہاں سکیسر پہ کیوں ٹنگے پڑے ہیں، کیوں نہ نیچے سون میں جا کر پرانے بھاڑ جھونکیں، اتنے زمیندار پڑے ہیں۔ کسی کی ڈیوڑھی تو مل ہی جائے گی۔ مہینے کے بعد چھلکوں میں سے ایک دو بھی بچ

ہتے تو دوا دارو کے لئے اٹھا رکھتی۔ پر یہاں تو شبرو کی ایڑی میں کنکر اتر جائے تو ہسپتال کے سامنے گھنٹوں ٹنچر کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے۔ اور جب جا کر وہ حرامزادہ کمپونڈر ذرا سی ٹنچر لاتا ہے، حرامزادے نے مجھے محتاج پاکر ہی تو آنکھ ماری تھی پچھلے سال۔"

فضلو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، مریاں نے کمپونڈر کی یاد دلائی تو آپے سے باہر ہو گیا۔ لپک کر کونے میں سے کلہاڑا اٹھایا اور بولا "پچھلے سال بھی تم نے مجھے شبرے کا واسطہ دے کر روک دیا تھا۔ مگر آج میں نہیں مانوں گا، ایسے سوٗر کے بچوں کو جواب نہ دیا جائے تو آج آنکھ ماری ہے کل ہاتھ ڈال دیں گے ـــــ جانے بھی دو ـــــ"

فضلو کی گرج کے جواب میں مریاں مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے کلہاڑے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور بولی "بس بھی چپ تو نہیں رہی تھی، میں نے کہا تھا کہ بابو، ذرا اپنی ماں کو بھی آنکھ ماری ہوتی، ذرا اپنی بہن کو بھی ٹٹول لیا ہوتا۔ حرامزادے، مجھے آنکھ مارتا ہے؟ مجھے؟ میں تو تجھ ایسے بیسیوں کو خرید کر قیمہ کر ڈالوں ـــــ میں بکتی جھکتی رہی اور وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہا اور کہتا رہا "آہستہ بہن، ذرا آہستہ گالی دو۔ ڈاکٹر سن لے گا۔" مجھے تو ہنسی آگئی تھی اس پر۔

فضلو نے کلہاڑا تو چھوڑ دیا مگر کمپونڈر کو، پھر سب بنگلے کے چوکیداروں کو اور مالی اور پھر بھشتو تک کو گالیاں دیتا رہا، اور جب مریاں نے بھشتو کو گالی دینے پر اعتراض کیا تو اس نے مریاں کو بھی گالی دے دی اور غصے میں بھرا

ہوا باہر آگیا ——— اور باہر رئیس خانے کے صحن میں ڈاک بنگلے والا صاحب کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"سلام" فضلو کا ہاتھ ایک دم ماتھے کی طرف اٹھ گیا، اس کے تنے ہوئے اعصاب میں اچانک سکون آگیا اور اپنے چہرے پر برسوں کی انکساری لاتے ہوئے وہ صاحب کے پاس جاکر بولا "کیا حکم ہے حضور"۔

صاحب کی کنپٹیوں پر دو چار بال سفید ہو چلے تھے مگر چہرے کی رنگت میں سرخی غالب تھی، آنکھوں میں بھیگی بھیگی چمک تھی اور ماتھے کے ابھار کے پیچھے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے جوانی صاحب کے روپ میں پختہ ہو گئی ہے، پک چکی ہے اور جیسے ابھی اس کے مساموں سے خون کے ننھے ننھے قطروں کی صورت میں رسنے لگے گی، اس نے سگریٹ کو انگلی پر چڑھا کر فضلو کی کوٹھری کی طرف اس تیزی سے اچھالا کہ کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی مریاں اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی، اور صاحب نے نہایت نرمی سے پوچھا "تمہارا ہی نام فضل دین ہے؟"

"جی" وہ صاحب کی گونجتی گونجتی آواز سے متاثر اور مرعوب ہو کر بولا "مجھے ہی فضلو چوکیدار کہتے ہیں حضور"۔

"فضل دین یا فضلو چوکیدار؟" صاحب مسکرایا۔

"جی بس فضلو چوکیدار" وہ عاجزی سے بولا۔

"کنوارے ہو ابھی؟" صاحب نے پوچھا۔

"کنوارا؟" فضلو بڑے ادب سے ہنسا "میں کیسے کنوارا ہو سکتا ہوں حضور،

میرا تو ایک بیٹا بھی ہے چار برس کا۔"

"اور بیوی؟"

"جی ہاں، بیوی بھی ہے۔"

"اور ماں باپ بہن بھائی؟"

"وہ سب لد چکے حضور۔"

"افسوس ہے۔"

فضلو نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

صاحب کچھ دیر تک رئیس خانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا، پھر پہلو میں لٹکتے ہوئے بیگ میں سے دوربین نکالی اور نورسون کی وادی کی طرف دیکھنے لگا۔ دوربین کے زاویے کو بدلتے ہوئے جب صحن کے حاشیے کے درختوں سے ادھر فضلو کی کوٹھری کی طرف مڑا تو اچانک تیورا سا گیا، پھر دوربین کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے ہنس کر بولا "لاحول ولا قوۃ، ایسا لگا جیسے تمہارا کوارٹر میرے اوپر چڑھا دوڑا ہے۔"

اور کوارٹر کی کھڑکی میں مریاں اور شیرو فریم میں سجی ہوئی تصویر کی طرح کھڑے تھے، اور صاحب کے پھینکے ہوئے سگرٹ کا دھواں نیلی لہراتی دھاری بن کر ان کے چہروں پر سے گزر رہا تھا۔

"فضلو"

"جی"

"اگر ہم ڈاک بنگلے سے یہاں تمہارے رئیس خانے میں اٹھ آئیں تو کیسا ہے؟"

فضلو کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی۔ اور لاے صاحب بھی

اپنے بیمبت سر کے بل کھڑا نظر آیا۔ رئیس خانہ بھی پھرکی کی طرح گھوم گیا، بڑی مشکل سے اس کے حواس ٹھکانے پر آئے اور وہ بولا "میرے ایسے نصیب کہاں!"

"واہ" صاحب بولا "یہ بھی کوئی بات ہے، اور مجھے تو یہ عمارت ڈاک بنگلے سے کہیں زیادہ پسند ہے، میں آج ہی یہاں اُٹھ آتا ہوں، اندر کچھ سامان ہے؟"

"جی سامان؟" وہ صابن دانی کی چوری کا راز صاحب کو بتا کر اسے رئیس خانے سے بدظن نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں، کوئی پلنگ؟"

"جی ہیں۔ دو۔"

"اور میز؟"

"جی ہے، اور دو کرسیاں بھی ہیں۔ ایک گلدان بھی ہے، ایک لالٹین ہے۔ غسل خانے کی بالٹی بھی ہے اور ــــــ"

صاحب مسکرایا اور سگرٹ جلاتے ہوئے بولا "اچھا تو میں ابھی آیا۔"

کچھ دیر تک فضلو وہیں کھڑا رہا، جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس کر رہ گئے ہیں، پھر وہ مڑ کر رئیس خانے کے برآمدے میں آ گیا۔ مگر وہاں سے الٹے پاؤں کوٹھری کی طرف بھاگا، کھڑکی میں سے آدھا اندر لٹک گیا اور پکارا "مریاں" ــــــ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر اندر لپکا، مریاں دروازہ روکے کھڑی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے جڑے ہوئے تھے۔ "تم اندر نہیں جا سکتے۔" وہ بڑے تحکمانہ انداز میں بولی۔

"اندر نہیں جا سکتا؟" فضلو نے ہانپتے ہوئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

وہ اسی لہجے میں بولی "پہلے میں تمہاری گالی کا جواب دوں گی"۔
"گالی کا جواب دو گی؟" فضلو صاحب کی آمد کا مژدہ سنانے کے لئے اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔

"ہاں" مریاں بولی "تم نے مجھے گالی کیوں دی تھی؟"
فضلو ٹالتے ہوئے بولا "بس دے دی، کیا ہوا؟"
"کیا ہوا؟" مریاں نے فضلو کا ہاتھ جکڑ لیا "یعنی کچھ ہوا ہی نہیں! میں نے آج تک کسی کی گالی نہیں سہی۔ سنا؟" — اور وہ ایک وقفے کے بعد بولی "سنا حرامزدے؟"
فضلو دم بخود رہ گیا، اور پھر ایک دم زور زور سے ہنستا ہوا مریاں سے لپٹ گیا۔ اسے اٹھا کر اندر کھاٹ پر پھینک دیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "تو مجھے اونٹ کی بچی معلوم ہوتی ہے، ایسا بلا کا کینہ ہے تجھ میں"۔
"تو ہوگا اونٹ کا بچہ" مریاں نے جواب دیا، مگر ناگواری سے نہیں۔ اب وہ مسکرا رہی تھی، اور تہمد کے اُلٹے ہوئے پلو سے اپنی پنڈلی ڈھانک رہی تھی، پھر وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے اور ان قہقہوں کے درمیان فضلو یوں اچانک اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بھڑ نے کاٹ لیا ہے "مریاں سنو صاحب رئیس خانے میں آرہا ہے"۔
مریاں کے قہقہے بھی رُک گئے۔
"صاحب ہمارے یہاں آرہا ہے۔ سنتی ہو؟"
مریاں حواس باختہ سی نظر آرہی تھی، چند لمحوں کے بعد بولی "سچ؟"
"ہاں ہاں۔ اللہ کی قسم، تمہاری قسم، وہ اپنا سامان لینے گیا ہے"۔
مریاں اداس ہو گئی "پر فضلو، وہ حرامزادے شکاری چھوکرے ہماری صابو ٹانی

تک اٹھائے گئے، یہاں دھرا ہی کیا ہے، اُلّو بول رہے ہیں دونوں کمروں میں، یہ صاحب رئیس خانے میں اِدھر آئے گا اُدھر بھاگ نکلے گا، میں تو کہتی ہوں اب یہاں جن بھی بسنے لگے ہیں۔ اس روز رات کو غسل خانے میں بالٹی بج رہی تھی۔"

لیکن فضلو نے اس وقت مریاں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ چند روز ہوئے اس نے بالٹی میں سے ایک مری ہوئی چوہیا نکال کر باہر پھینکی تھی، اس نے مریاں کو سمجھایا کہ صاحب کو بس ایک پلنگ چاہیئے، اور بس، ـــــ پھر وہ رئیس خانے کا سارا سامان ڈھو کر برآمدے میں لے گئے، کمرے جھاڑے، پلنگ رکھے، کپڑے ٹانگنے والی کیلوں پر سے مکڑی کے جالے اتارے، اور گل دان دھویا جا چکا تو مریاں ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے ہاں تازہ پھول مانگنے چلی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ مالی اور انجینئروں کے بنگلے کا چوکیدار سامان اٹھائے آ رہے ہیں۔ کچھ فاصلے پر صاحب بھی سگرٹ پیتا آ رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں نیچے پگڈنڈی پر جمی تھیں اور مریاں اس کے قریب سے گزری تو جب بھی اس نے اوپر نہ دیکھا، پھر جب مریاں بہشتو سے پھول لے کر آئی تو وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا، اور فضلو صحن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا، مریاں نے کوٹھری میں جا کر کھڑکی میں سے فضلو کو پکارا اور پھول اس کے حوالے کئے، فضلو نے اندر رئیس خانے میں جا کر انہیں گل دان میں سجایا، باہر آیا اور گل دان صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا،

صاحب چونکا۔ "کون لایا ہے یہ پھول؟"

فضلو بولا۔ "جی بیوی لائی ہے۔"

"ڈاک بنگلے کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہیں تو ڈاک بنگلے کے، وہیں سے مانگ لائی ہے۔"

"پھر وہی منحوس ڈاک بنگلے کے پھول"۔ صاحب نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "آج تو خیر مریاں پھول لے آئی ہے، لیکن کل سے پھول نہیں پتے سجا دیا کرو، یہی رئیس خانے کے درختوں کے پتے، سمجھے؟"

فضلو حیران ہو رہا تھا کہ آخر صاحب کو اس کی بیوی کا نام کیسے معلوم ہوا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بولا "تمہاری بیوی کا نام مجھے مالی کی بہن نے بتایا تھا ابھی ابھی۔ مریاں ہی ہے نا؟"

"جی مریاں ہی ہے" فضلو نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مریم ہوگا۔ تم لوگوں نے مریاں بنا لیا"۔

"مریاں ہی تھا صاحب"۔

صاحب کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کتاب ٹھپ سے بند کر کے بولا۔ "میری مرحومہ بیوی کا نام مریم تھا"۔

فضلو کو خاموش اور متاسف پا کر بولا۔ "بجلی کا پنکھا بند کر رہی تھی کہ کسی تار وار کو ہاتھ چھو گیا اور وہیں ختم ہو گئی ـــــ شکر ہے یہاں سکیسر پر ابھی بجلی نہیں آئی"۔

"جی شکر ہے" فضلو نے کچھ سمجھے بغیر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی، اور صاحب پھر سے کتاب کھول کر ورق الٹنے لگا۔

چار روز تک پلاؤ اور مرغ پکاتے پکاتے مریاں کی بری حالت ہو گئی۔ جب دیکھو چولھے کے سامنے بیٹھی ہے، چولے کی آستینیں شانوں تک چڑھا رکھی ہیں، چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ بال بکھر رہے ہیں، اور ان پر راکھ کے ذرّے جم رہے ہیں،

ہانفتے ہوئے ہیں۔ شیرا رو رہا ہے، فضلو بوکھلا رہا ہے، لیکن جب رات کو سب کاموں سے فرصت پا کر وہ کھاٹوں پر آتے تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے، اور دلوں میں سکون ہوتا، شیرے کو دو دن بد ہضمی کی شکایت رہی لیکن اب وہ بھی مرغن غذا کا عادی ہو گیا تھا، صاحب نے اُسے ایک نرم اور گرم مفلر بھی دیا تھا جسے وہ رات کو بھی گلے میں لپیٹے رکھتا اور جب وہ گہری نیند سو جاتا تو فضلو دھیرے سے اس کا مفلر کھینچتے ہوئے کہتا "ہمیں بھی تو چھو لینے دے سوئر کے بچے"——

دونوں خوب خوب ہنستے، صاحب کی ذرا ذرا سی حرکتوں کو بڑے احترام سے یاد کرتے، اور مریاں بارش کی دعائیں مانگتی، کیونکہ صاحب بارش کے لئے بہت اداس تھا۔ ہر وقت آسمان کی طرف دیکھتا رہتا، اور جب نیچے وادی میں بادل گرجتے اور نمی سے لدے ہوئے جھونکے رئیس خانے کے درختوں سے لپٹتے ہوئے آتے اور اس کی کتاب کے ورق الٹ دیتے گلدان میں سجے ہوئے پتوں کو اِدھر اُدھر بکھیر دیتے اور اس کے بالوں کو ماتھے پر گرا دیتے، تو وہ بڑے دُکھ سے کہتا "فضلو ——بھئی یہاں آس پاس کوئی پیر ویر ہو تو اس سے بارش کا تعویذ لکھوا لاؤ، یہ بھی آخر کیا ساون ہوا کہ سون کی ندیوں کی گونج رات کو یہاں تک سنائی دے جاتی ہے، اور سیکسر لٹے ہوئے رنڈوے کی طرح بے بس کھڑا ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ بادلوں کی ساری فوج یہیں سے گزرتی ہے، پچھلے سال تو پھوار کسی وقت رکتے ہی میں نہیں آتی تھی۔ مگر وہ ساون بڑا بے لطف تھا، ڈاک بنگلے میں مینہ کا کیا مزا۔ چھت پر بوندوں کے گرنے تک کی آواز نہیں، کھڑکیوں پر لحافوں جیسے پردے لٹک رہے ہیں، ڈاک بنگلے میں رہنا یا کسی غار میں پڑے رہنا برابر ہے —— بھئی فضلو،

تم تو عرصے سے یہاں ہو، اب کے ساون یہاں کب آئے گا؟ ——— اور وہ دوربین لگا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگتا۔

وہ فضلو سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ اسے اپنے گھر کی ساری باتیں بتادی تھیں، اس کی مرحومہ بیوی کا نام مریم اور اس کا اپنا نام یوسف تھا، مریم مر چکی تھی، شادی کو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ مریم کو بجلی کھا گئی، اور وہ گھبرا کر خواہ مخواہ لمبے لمبے سفر کرنے لگا، مریم ساون میں مری تھی اس وقت اس کی کوٹھی کی چھت پر بوندیں گا رہی تھیں، اور روشندانوں کے شیشوں میں سے بجلی کے فوارے اندر لپک لپک کر مریم کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو چندھیا جاتے تھے، ویسے بجلی کا پنکھا چل رہا تھا مگر ساون کی جھڑی نے خنکی پیدا کر دی تھی اس لئے یوسف نے مریا آں سے پنکھا بند کرنے کو کہا اور یوں اپنی نئی نئی بسی ہوئی دنیا اجاڑ بیٹھا، وہ رات بھر مریم کی لاش سے چمٹا رہا اور جب دوسرے روز رشتہ دار میت کو قبرستان لے جانے لگے تو وہ نینی تال چلا گیا، وہاں سے رنگون پہنچا، رنگون سے مدراس اور بمبئی کا چکر لگاتا وہ کراچی اور پھر کوئٹہ میں آیا، اور چند روز وہاں کے جلے ہوئے پہاڑوں میں گھوم کر وہاں سے اپنے وطن ——— حسن اور محبت کی اس سرزمین پنجاب میں وارد ہوا، اور مری جانے کے بجائے سکیسر آنکلا، اور سکیسر کے ڈاک بنگلے کے باغیچے میں کھڑے ہو کر اس نے پہلے روز مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے دوربین لگائی تو کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اب کے بھی یہیں آنکلا۔

"سکیسر پنجاب کا دل ہے"۔ یوسف نے کہا،

فضلو نے ان چار دنوں میں پہلی بار یوسف سے اختلاف کیا: "نہیں صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، پنجاب کا دل تو لاہور ہے، اسے پنجاب کا دل نہ کہئے، یہاں پتھروں اور جھاڑ جھنکاڑ کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے، ایک دہ جھیل ہے، سو بھادوں کی دوپہروں میں ایسی گندی باس اڑاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے دنوں کا مرا ہوا گدھا پڑا سڑ رہا ہے۔ اور پھر یہاں کے لوگ، توبہ کیجئے حضور، کسی سے ذرا سی اَن بن ہوئی تو یہ نہیں کہ گھونسے طمانچے سے غصہ نکال لیا، بات بات پر برچھے پسلیوں کو کاٹتے ہوئے نکل رہے ہیں اور تیز کلہاڑیاں گردن کی نسیں توڑتی ہوئی جا رہی ہیں، توبہ کیجئے صاحب"۔

لیکن صاحب کو اصرار تھا کہ پنجاب کا کوئی اور حصہ پنجاب کا دل کہلانے کا حقدار نہیں، دوسرے روز یہی بحث چھیڑتے ہوئے اس نے فضلو سے کہا۔ "سکیسر کی خوشگوار ہوا اور وادی کے نظاروں کو تو رکھ دو ایک طرف مجھے یہ بتاؤ فضلو، کہ یہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کا پنجاب بھر میں کہیں جواب مل سکے گا۔ نہیں؟ گھوم آؤ پنڈی سے ملتان اور میانوالی سے دلی تک، مجال ہے جو تمہیں ایسی کافر آنکھیں، ایسی گھنی اور لمبی پلکیں، ایسے قد اور ایسے جسم، ایسا رنگ اور ایسی چال مل جائے۔ میرے خیال میں یونان کے بادشاہ سکندر نے جب پنجاب پر حملہ کیا تھا تو اس وادی میں اس کی فوج کا کوئی دستہ ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ ورنہ یہاں سو میں سے پچانوے چہروں کا کٹ یونانی دیوی دیوتاؤں کا سا کیوں ہے، میں تو جسے بھی دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہومر پڑھ رہا ہوں، عورتیں ہیں تو دیویاں ہیں، مرد ہیں سو اپالو ہیں، ایسے تیکھے نقش تو انگریز بیگمین کو بھی نصیب نہیں ہوئے،

ایسی پامال کر دینے والی خوبصورتی تو دیلنٹینو کو بھی نہیں ملی تھی۔"

فضلو اس وقت کچھ ایسے منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے اس کا جبڑا پیدائشی کھلا ہے، اور اب تک جڑنے نہیں پایا، اس کی پتلیوں تک میں کوئی حرکت نہیں تھی، اور وہ یوسف کے ہونٹوں پر نظریں جمائے بُت بنا بیٹھا تھا۔ یوسف کے خاموش ہونے کے کافی دیر بعد تک وہ یونہی بیٹھا رہا، پھر جب یوسف نے اسے پکارا تو وہ جیسے نیند سے چونکا "جی" اس کے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ "جی" وہ بولا۔ "جی ہاں، آپ سچ کہہ رہے تھے، خوبصورتی تو یہاں بلا کی ہے، ایسی ایسی بیٹی پیدا کی ہے یہاں کی ماں نے کہ سبحان اللہ، آپ نے ٹھیک کہا، اگر آپ خوبصورتی کو دیکھتے ہیں تو سچ مچ یہی ہے پنجاب کا دل۔"

یوسف نے سگرٹ جلایا، بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دیر تک تانبے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر باہر صحن میں آگیا۔ مگر پھر فوراً اندر لپکا، ایک دم بادل جیسے پھٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اڑی اور بیٹھ گئی، پرنالوں کے دہانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آگرے اور آن کی آن میں سکیسر پہ جوانی آگئی، یوسف ابھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمیٹنے نہیں پایا تھا کہ فضلو کی کوٹھری کی کھڑکی میں سے مریاں چلائی۔

"اے فضلو، اے لپک کے آ، سب کچھ بھیگ گیا باہر چولھے کے پاس ــــــ"

فضلو نمدے کو گھٹنوں تک اُٹھا کر باہر بھاگنے کو تھا کہ یوسف نے کہا:

یہ مریاں بھی شاید"

"جی مریاں ہی تھی" اس نے جواب دیا۔

"آج پہلی بار اس کی آواز سنی ہے، شاید پردہ کرتی ہے" یوسف یونہی روا روی میں بولا۔

فضلو نے تہمد کو پھر گھٹنوں تک اٹھاتے ہوئے کہا "جی پردہ تو نہیں کرتی بس ذرا ــــ"

کھڑکی سے آواز آئی۔ "کان کتے تو نہیں لے گئے"

فضلو نے گھبرا کر یوسف کی طرف دیکھا "گالیاں بکنے لگی سوٗر کی بچی"

"جاؤ جاؤ بھاگو" یوسف نے ہنستے ہوئے کہا "کہیں مجھ پہ بھی نہ برس پڑے"

اور فضلو جو صحن میں پہنچ چکا تھا۔ موسلا دھار بارش سے بے پروا ہو کر رک گیا اور پلٹ کر بولا "مجال ہے اس کی حضور، زبان کاٹ کر انگاروں پر نہ رکھ دوں" ــــ اور وہ لپک کر کوٹھری میں گھس گیا۔

پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو صاحب کرسی پر بیٹھا ٹانگیں میز پہ رکھے، نیچے لٹکے ہوئے ہاتھ میں بیکار جلتا ہوا سگریٹ پکڑے گنگنا رہا تھا۔

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھُری ہے جو اُترتی چلی جائے

اس روز کوٹھری سے رئیس خانے تک کھانا لانے میں صاحب کی برساتی نے بڑا کام دیا۔ فضلو اور مریاں اسے اپنے سروں پہ تان لیتے اور پھر دونوں

طشت تھامے ہولے ہولے رئیس خانے میں آتے، مریاں برآمدے ہیں رک جاتی، فضلو طشت اندر لے جاتا، باہر آکر وہ پھر سے برساتی کو سرد ال پر نان کر کوٹھری سے کھانے کی دوسری قسط لینے جاتے، ایک بار جب مریاں باہر برآمدے کے ایک ستون کا سہارا لیئے برساتی پر سے پانی جھٹک رہی تھی۔ تو اندر سے آواز آئی "باہر کون ہے؟"

"مریاں ہے صاحب" فضلو بولا

"باہر کھڑی کیا کر رہی ہے؟" یوسف کی آواز آئی۔ "ٹھنڈ ہو رہی ہے، اس سے کہو اندر آجائے یا کوٹھری میں چلی جائے۔"

"جی کوٹھری میں چلی جائے گی۔" فضلو نے کہا۔

لمحے بھر کے وقفے کے بعد یوسف بولا: "بہت اچھا کھانا پکاتی ہے تمہاری بیوی۔"

فضلو نے فوراً کہا۔ "جی وہ کیا پکاتی ہے۔ گھی کے کھیل ہیں سارے۔"

اور مریاں باہر ہی سے بولی۔ "تیرے باپ کے کھیل ہیں۔" اس کی آواز بلند ہوگئی "ذرا کسی روز صبح سے شام تک چولھے کے پاس بیٹھو تو، نانی یاد آجائے حرامزادے کو"——— اور وہ بھیگتی ہوئی اپنی کوٹھری کی طرف چلی۔

یوسف کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ لال ہو گیا، اس نے حواس باختہ فضلو سے قہقہوں کے درمیان پوچھا۔ "مزاج کیسے ہیں تمہارے؟"

فضلو دانت پیستا ہوا زیرلب بولا ”سور کی بچی“
یوسف کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد فضلو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا ”کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا حضور“
”تمہارا غصہ تو ٹھنڈا ہو لے“ وہ بولا ”کھانا تو پیٹ میں جا کر گرم ہو جائے گا۔ گھبراتے کیوں ہو فضلو، تمہیں اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے ملا ہے پتھر سے نہیں ملا“

فضلو کا غصہ شاید ابھی اترا نہیں تھا ”اس سور کی بچی سے تو یہ بھی دور نہیں حضور کہ سچ مچ پتھر اٹھا کر دے مارتی۔ گھروں میں ہر میاں بیوی کی کبھی نہ کبھی ٹھن ہی جاتی ہے پر حضور کے سامنے بک دینے کی عادت بہت بری ہے“
”لیکن حضور کو تو لطف آ گیا“ یوسف نے کہا، اور فضلو کی ندامت کسی حد تک دور ہو گئی۔

مینہ کچھ دیر کے لیے تھم کر پھر برسنے لگا، تھما اور پھوار میں بدل گیا، یوسف نے دونوں طرف کی کھڑکیاں کھول دیں اور چھت، درختوں کے پتوں اور پتھروں اور چٹانوں پر پھوار کی گنگناہٹیں سننے لگا، فضلو سونے سے پہلے یوسف سے حسب معمول ”کوئی اور کام“ پوچھنے آیا تو یوسف نے کہا ”ہاں۔ ایک اور کام ہے تو سہی“ فضلو ہاتھ باندھے انتظار میں کھڑا رہا۔ یوسف سگرٹ جلا کر تین چار کش لگانے کے بعد بولا ”ادھر آؤ“
فضلو چند قدم آگے بڑھا۔
”اور آگے آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ پلنگ پر“ یوسف نے بستر کے ایک حصے

کو ٹھیک کر کہا۔

"پلنگ پر حضور!" فضلو دم بخود رہ گیا۔ "پلنگ پر کیسے صاحب!"

یوسف نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا کر بولا۔ "ایسے۔"

فضلو کچھ اس انداز سے بیٹھا جیسے وہ نرم نرم گدے کے بجائے تپتے توے پر بیٹھا ہے "حضور!" اس نے حیرت سے کہا اور یوسف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

یوسف آج کچھ کھویا کھویا سا تھا، لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا آدھا حصہ روشن تھا۔ فضلو کو گمان سا ہوا کہ اس کی آنکھ بھیگ رہی ہے، اور گال پر پانی کا ایک قطرہ چمک رہا ہے، باہر پھوار کی مسلسل گنگناہٹ سے فضا پر اسرار ہو رہی تھی، پھوار نے فضا میں خنکی کے علاوہ کاجل بھی گھول دیا تھا کھلی کھڑکی میں سے دور کسی بنگلے کے دو روشندان ذرا سے روشن تھے۔ میز پر رکھے ہوئے گل دان میں درختوں کے پتے بے ترتیب ہو رہے تھے، لالٹین کی زبان ہر تیز جھونکے کے ساتھ چلو بھر دھواں اوپر اچھال دیتی تھی، قسم قسم کے پتنگوں کے ایک ہجوم نے لالٹین کی شیشی پر ہلّہ بول رکھا تھا۔ ان پتنگوں میں ایک بھڑ بھی تھی، جس کے پروں کی بھنبھناہٹ دوسرے پتنگوں پر چھائی ہوئی تھی، فضلو نے ایک بار پھر یوسف کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ اب گال پر چمکتا ہوا قطرہ ٹھوڑی کی طرف بہ آیا تھا اور آنکھ کے گوشے میں ایک نیا قطرہ ڈھلک جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو فضلو!" یوسف نے پوچھا۔

فضلو نے جھجکتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے اس کے گال کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے بس اتنا کہہ سکا "یہ حضور ـــــ یہ ـــــ" اور اس نے انگلی کو مٹھی میں شامل کرکے ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ آنسو ہیں" یوسف فضلو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "آنسو بہانا میری عادت ہے، اسی لئے تو مجھے ساون کا انتظار تھا، مریم انہی دنوں مجھ سے چھنی تھی نا اس لئے ساون کی راتیں میں نے ہمیشہ روتے روتے گزاری ہیں، رونا ہنسی نہیں، ایک آنسو بہانے کے لئے اتنا بہت سا لہو جلانا پڑتا ہے، اور میں رات رات بھر روتا ہوں، میں بہت دکھی ہوں فضلو، میرے پاس روپیہ ہے، جاگیریں ہیں، زمینیں ہیں، کوٹھیاں ہیں، لیکن میں کتنا غریب ہوں، مریم کے بغیر میں کتنا غریب ہوں" اس نے ایک طرف سے رومال اٹھا کر آنکھیں پونچھیں اور فضلو کے پاس کھسک کر بولا "میں تو ایسا لٹا ہوں فضلو کہ اب کبھی آباد نہیں ہو سکوں گا"

"کیوں نہیں آباد ہوں گے حضور، ـــــ ضرور ہوں گے" فضلو نے کچھ بولنا اپنا فرض سمجھا۔

"مگر کیسے؟" یوسف نے پوچھا۔

فضلو خاموش رہا، وہ صرف تسلی دینا چاہتا تھا۔ اس کے پاس آبادی کی کوئی تجویز نہ تھی۔

"ویسے فضلو" یوسف نے بڑے رازبھرے لہجے میں کہا "اگر تم میری مدد کرو تو اس ٹھنٹھ میں کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں"

"میں حضور؟" فضلو پر حیرتوں کی تہیں جم رہی تھیں۔

"ہاں تم ـــــ تم اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کیوں سمجھتے ہو فضلو، تم کوئی معمولی

آدمی نہیں ہو۔ دنیا کا کوئی انسان معمولی نہیں، اور تم چاہو تو میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہو —— کر سکو گے؟"

"کروں گا حضور" اس نے کہا۔ "کر سکا تو ضرور کروں گا، پر میں کر ہی کیا سکتا ہوں"۔

"پھر وہی بات! دیکھو فضلو، بات یہ ہے کہ میں یہاں ریسٹ خانے میں اکیلے پڑا راتیں گزار رہا ہوں تو سچ کہتا ہوں اکیلے رہنا کوئی نعمت نہیں مجبوری ہے اور ——"

"تو حضور" فضلو کے ذہن میں ایک تجویز آئی "میں سو جایا کروں آپ کے کمرے میں"

"نہیں بھئی" یوسف ذرا سا مسکرایا۔ "تم مجھے آباد کرنے کے لئے اپنی دریاں کو برباد کر دو گے، ایسی بات نہیں، بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ —— خیر، رہنے دو، تم برا مان جاؤ گے"

"برا کیوں ماننے لگا صاحب۔ آپ حکم تو دیجئے"

"بات یہ ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو، لیکن اس کے لئے تمہیں بہت دلیر بننا پڑے گا، دیکھو، کیا اس سکیسر پہ —— یا نیچے اس وادی میں ——"

وہ خاموش ہو گیا، اٹھا اور ایک کھڑکی بند کر کے اور لالٹین کو ذرا سا دھیما کر کے پھر فضلو کے پاس آ بیٹھا۔ فضلو ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔

اور پھر یوسف تیزی سے بولنے لگا "دیکھو فضلو دوست، کیا اس سکیسر پہاڑ پہ کوئی ایک بھی ایسی عورت نہیں ہو گی جو میری راتیں آباد کر سکے، کوئی ایسی لڑکی نہیں ہو گی جو مجھ سے ایک سو روپے لے کر رات بھر میری زندگی کی جاں شاخ

پر پھول بن کر جھکے اور صبح کو چلی جائے، کیا خدا کے ایک دکھی بندے کی دنیا کو چند گھڑیوں کے لئے آباد کر کے تمہارا دل خوش نہیں ہو گا؟ فضلو، تم گھبرا کیوں رہے ہو؟ تم تو ہانپ اور کانپ رہے ہو، میں تمہیں ہر رات کے دس روپے دوں گا میں مفت خور نہیں ہوں، مجھ پر جوانی کا بھوت سوار ہوتا تو میں لاہور واپس جا کر ہیرا منڈی میں ڈیرے ڈال لیتا، لیکن مجھے کاغذی پھول نہیں چاہئیں، اسی لئے تو میں رنگون سے کوئٹے تک بھٹکتا پھرا، مجھے سچ مچ کی ایک عورت چاہیئے، سچ مچ کی ایک عورت —"

یوسف ایک لمحے کے لئے رکا، فضلو یوں ہانپ رہا تھا جیسے کوئی بہت اونچا پہاڑ طے کر کے آ رہا ہے، یوسف کی خاموشی کے دوران میں اس کی سانسیں اور تیز ہو گئیں، اس کے پپوٹے اوپر اٹھ گئے وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا "نہیں صاحب میں غریب ہوں، کمینہ نہیں ہوں، مجھ سے ایسا نہیں ہو گا، میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

"فضلو" یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس کی آواز بچوں کی طرح بھرا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہ نکلیں "نہیں فضلو، تم میرے لئے ضرور ایسا کرو گے، میرا دل اتنی مدت سے ویران پڑا ہے، تم چاہو تو اسے آباد کر سکتے ہو اور یہ بڑا نیکی کا کام ہے، ایک پیاسے کتے پر ترس کھا کر اسے پانی پلا دینے سے لوگ جنت میں جگہ پاتے ہیں تو ایک انسان کی بھوکی روح کو سیراب کرنے سے نہیں کتنا ثواب ملے گا، اس کا اندازہ ——"

فضلو اپنا ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گیا اور کہیں رکے بغیر دروازے میں سے نکلتے ہوئے بولا "نہیں صاحب، میں کسان کا بیٹا ہوں، کنجر نہیں ہوں۔"

فضلو نہایت غصے میں برآمدہ اور صحن طے کر کے اپنی کوٹھری کے دروازے تک آیا۔ تو اندر مٹی کے چراغ کی پیلی پیلی جناتی روشنی دیکھتے ہی اسے اپنی اور مریاں کی جھڑپ یاد آ گئی، کھانا کھلانے کے دوران میں بھی وہ اس سے نہیں بولی تھی۔ پھر جب وہ صاحب سے رات کے لیے رخصت ہونے جا رہا تھا تو اس نے دھم سے کھاٹ پر گر کر چادر تان لی تھی اور پھر اب تک اس نے چراغ نہیں بجھایا تھا فضلو دروازے پر یوں ٹھٹک گیا جیسے صاحب نے اسے ننگا کر دیا ہے، وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص کبھی اس سے عورتوں کی دلالی کی خدمت بھی لے گا، اور خاص طور سے یہ صاحب ——"

وہ اندر آ گیا، پگڑی اتارے اور چراغ بجھائے بغیر کھاٹ پر سیدھا لیٹ گیا، اور کالی بھجنگ چھت میں سے کہیں دور دیکھنے لگا۔ پھوار رک گئی تھی، ایک مینڈک کہیں قریب کے گڑھے میں ٹرا رہا تھا، چراغ کی لو کا دھواں برمے کی طرح چھت میں سیدھا گھسا جا رہا تھا، شبیرہ نیند میں بڑبڑایا "وہ اتنا تھوڑا سا تو پلاؤ دیا ہے ماں —— اور بھی دو نا —— وہ سی بوٹی دے دو نا" —— فضلو نے سر اٹھا کر شبیرہ کی طرف دیکھا، وہ پرانے کھیس میں کچھ ایسے سمٹا ہوا تھا جیسے اس سے زیادہ سمٹے گا تو پسلیاں توڑ بیٹھے گا۔ مریاں بھی گٹھری بنی پڑی تھی، خود اس کا بستر بھی یخ ہو رہا تھا، اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور آنکھیں بند کر لیں، کہیں سے سردی کی ایک دھار اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی جھریوں میں تو سٹریاں بھی ہیں، اس نے گارا تھوپ دیا تھا، تو پھر یہ سردی کھڑکی ہی سے آ رہی ہوگی، وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا، اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، اسے بھیڑنے لگا تو اسے

رئیس خانے کی کھڑکی نظر آ گئی، پہلے تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے گہرے پیلے رنگ کی ایک چادر رئیس خانے کی دیوار میں جڑ دی گئی ہے، مگر پھر اسے چادر کے نچلے حاشیے پر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی ــــ تو یہ صاحب کا سر تھا! ــــ تو وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھا تھا؟ ــــ بیٹھا رہے ــــ اس نے سوچا ــــ دیکھتا رہے عورتوں کے خواب، اس نے کھڑکی کا پٹ دھک سے بند کر دیا۔ مریاں نے چونک کر چادر میں سے سر نکالا اور ایک لمحے کے بعد پھر چادر میں چھپ گئی۔

"جاگ رہی ہو؟" فضلو نے پوچھا، مگر وہ خاموش رہی، اور کہیں اندر سے وہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہے، سب خاموش رہیں، اور اس سناٹے میں وہ اپنے دماغ میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کو بجھانے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہوا سو جائے ــــ وہ پھر سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔

"چراغ بجھا دو" چادر کے اندر سے مریاں کی آواز آئی۔

"بجھا دوں گا" اس نے ناگواری سے کہا "جاگ رہی ہو؟"

مریاں خاموش رہی۔

فضلو نے مریاں کو ایک زناٹے کی گالی دینا چاہی۔ مگر اس سے اس سناٹے کے مجروح ہو جانے کا احتمال تھا جو اس وقت فضلو کے لئے ہوا کی طرح ضروری تھا۔

دیر تک اسے اپنے آپ سے شرم آتی رہی، ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ رو دے، آنسو اس کی پتلیوں کے پیچھے مچل رہے تھے، اور گلے میں کچھ اٹک سا گیا تھا، اور سارا خون دماغ میں جمع ہو رہا تھا، پھر اچانک کھولتے ہوئے خون میں کوئی چیز جھنجھنائی، اور فضلو نے تیزی سے کروٹ بدل لی، ایک اور جھنکار

ہوئی، اور وہ تڑپ کر دوسری کروٹ پڑ آگیا، یہ جھنکاریں اور چھناکے اب اس کی رگوں میں دوڑنے لگے، اس کے ٹخنے تک بج رہے تھے، اس کے کانوں کی لویں تک تپ رہی تھیں، وہ اٹھ بیٹھا، چراغ بجھا دیا، اور پھر دیر تک وہیں کھڑا بجھے ہوئے چراغ کی لو کا بدبودار دھواں پیتا رہا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا، کوئی بھیگا ہوا پرند چوٹھے کے پاس آگرا، پھر اٹھا اور دیوار پر کھلونے کی طرح جا بیٹھا، وہ شاید تھک گیا تھا۔

ساری دنیا سو گئی تھی، صرف صاحب جاگ رہا تھا یا فضلو ــــ صاحب کی جیب میں روپے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے، فضلو کی جیب خالی تھی اور آنکھوں میں جلن تھی، اور اندر شیرو مارے سردی کے اب بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہا تھا اور کراہ رہا تھا، اندر جاکر اس نے دروازہ بند کر لیا، چراغ جلایا۔ خالی صندوقوں کے اوپر پڑا ہوا ایک لحاف اٹھا کر شیرو کو اوڑھا دیا۔ چراغ بجھایا اور پھر کھاٹ پر آگیا۔

دیر تک اس لے سو جانے کی کوشش کی۔ آیتہ الکرسی تین بار کی بجائے سو بار پڑھ ڈالی، اپنے بالوں کی ایک لٹ کو اتنی دیر تک مروڑتا رہا کہ بالوں کی جڑیں دکھنے لگیں، ٹھوڑی کے ایک طرف ننھے سے مہاسے کو ناخن سے اتنی دیر تک کھرچا کہ وہ زخم بن گیا، اُٹھ بیٹھا، اور دیوار کا سہارا لے لیا، پھر جب پیٹھ دکھنے لگی تو کھاٹ پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ پسلیوں میں چھریاں چبھنے لگیں تو پھر اُٹھ بیٹھا۔ اور دماغ میں دھماکے کے ساتھ ایک چھناکا ہوا ــــ دس روپے روز ــــ بیس دنوں میں دو سو روپے ــــ دس مہینوں کی تنخواہ ــــ اور پھر سب سو رہے ہیں، سب سو جاتے ہیں، اور اسے روپیہ چاہیئے، عورتوں کو بھی روپیہ چاہیئے ــــ ماؤں باپوں کو بھی روپیہ چاہیئے ــــ مولوی حلیم نے دو

لڑکیوں کو خراب کیا، پکڑا گیا، قید ہوا، چھوٹ کر آیا، لعنت ملامت ہوئی، اور پھر دنیا بھول گئی اور وہ پھر سے مسجد کا امام ہو گیا، دنیا بھول جاتی ہے، دنیا سو جاتی ہے، چوکیدار تک سو جاتے ہیں، اور اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ لوگوں کو عورت تو کیا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، اور بشنو کے کانوں میں سونے کے کانٹے ہیں، اور سر پہ آبی دوپٹہ ہے —— اور مریاں کے کانوں کی لوؤں کے سوراخ اداس ہیں اور اتنے لمبے لمبے بالوں پہ ایسے موٹے کھدر کی چادر ہے جو لوہے کی چادر پہ رگڑی جائے تو اُسے بھی گھسا کر کاغذ بنا دے، —— اور صاحب اب آدھی رات کو اسی طرح بیٹھا ہے، وہ رو رہا ہے — وہ مرد ہو کر عورت کی طرح رو رہا ہے، اس کی آواز میں للکار کی جگہ پکار ہے وہ اتنا بڑا آدمی ہے، اتنا بڑا زمیندار ہے، اور اتنا غریب ہے، اتنا محتاج ہے کہ ایک چوکیدار سے ایک عورت کی بھیک مانگ رہا ہے، اور لطف یہ ہے کہ وہ اس بھیک کی قیمت بھی ادا کرے گا۔

"مریاں، جاگ رہی ہو؟"

"کیا ہے؟" غصے سے بھری ہوئی مریاں کی آواز آئی۔

"ارے! تم تو جاگ رہی ہو؟" وہ یوں گھبرا کر بولا جیسے مریاں کے سامنے اچانک ننگا ہو گیا ہے۔

وہ دیر تک چپ بیٹھا رہا، اس کی سانسیں تک بے آواز تھیں، اسے اپنا باپ یاد آ گیا، جس کے ایک ہاتھ میں مٹی کی ہتھی اور ایک میں تسبیح ہوتی تھی، اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس روز اس کی کوئی نماز قضا ہوئی اسی روز قیامت آ جائے گی، اور وہ جیل میں مرا کیونکہ مہاجن نے قرضے کی واپسی سے ناامید ہو کر

نالش کر دی اور وہ بخار کی حالت میں اندر بھیج دیا گیا، اور مر گیا ——— فضلو کی انگلیوں کی پوروں میں چل سی ہونے لگی، جیسے سرسریاں جلد کے اندر گھس کر پوروں کے دائرے میں گھوم رہی ہیں ——— روپیہ ہے تو عزت ہے، نیک نامی ہے، صحت ہے، روپیہ نہیں تو اجڑے ہوئے رئیس خانے کی چوکیداری ہے، اور مریاں کی گالیاں ہیں اور شیرو کی کراہیں ہیں، روپیہ نہ ہو تو آدمی خدا تک کی راہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مسجد میں تیل تک نہیں دے سکتا، جمعرات کو مولوی کے لئے ایک روٹی تک نہیں پکوا سکتا۔ سر جھکا کے چلتا ہے، ہاتھ جوڑتا ہے، منت کرتا ہے، منہ میں بھر آنے والا پانی تھوکتا ہے، ——— اور پھر یہاں حوریں تو نہیں بستیں، عورتیں بستی ہیں، اور یہ عورتیں وہ پریاں نہیں کہ چھو لو تو طوطے بن جائیں، بہشتو ہی کو لو: اس کی آنکھوں میں ایسا باؤلاپن ہے جیسے ذرا سا اشارہ کر دو تو بھاگ کر آئے گی اور گود میں بیٹھ جائے گی۔ مریاں جیسی عورتیں ذرا کم ملتی ہیں یہاں، جو پردہ نہیں کرتیں مگر پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ کوئی دیکھ لے تو خود ہی پانی پانی ہو جائے، اور وہ سرائے کے بھٹیارے کی رانی، خوبصورت ایسی کہ لٹھے کے تھان کی مورت، اور ندیدی ایسی کہ اٹھنی دکھاؤ تو بھوکی کتیا کی طرح بھاگی آئے، اور پھر یہ مسافر عورتیں جو سروں پہ پوٹلیاں رکھے سڑک پر سے گزرتی ہیں، اور یہ کنواریاں جن کی مدت تک شادیاں نہیں ہو سکتیں مارے غریبی کے، اور یہ بیاہی عورتیں جن کے شوہر ہانگ کانگ پولیس میں ہیں اور پانچ سال کے بعد ہی تین مہینے کے لئے گاؤں کا چکر لگا پاتے ہیں، جبکہ ان کی بیویاں گاؤں کی بوڑھی دایہ کو چار بار انعام دے چکی ہوتی ہیں، لاحول ولا قوۃ، آدمی ایسا بزدل بھی نہ ہو کہ عورت کا نام سنا اور گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ ایک دم اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا، رئیس خانے کی کھڑکی اسی طرح روشن تھی، اور صاحب کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا، فضلو نے کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر دروازہ کھولا اور تیزی سے صحن کو طے کر کے برآمدے میں گیا، دروازے پر جاتے ہی لوہے کی لاٹھ کی طرح جم گیا، زندگی کے سارے آثار اس کے وجود سے غائب سے ہو گئے - اور اگر فوراً یوسف کی آواز اسے نہ چونکاتی تو شاید وہ قیامت تک یونہی جما کھڑا رہتا -

"رک کیوں گئے فضلو؟" یوسف بولا -

اور فضلو کے پاؤں تلے جیسے ایک سپرنگ نے اسے اچھال کر اندر پھینک دیا -

"بیٹھو" یوسف نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا -

فضلو نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر چھت پر ایک نظر یوں دوڑائی، جیسے وہاں بھی کوئی دروازہ کھلا ہے، پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں، اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے رک رک کر بولا "جی میں کروں گا —— کل سے کروں گا"

اور اس کے بعد جیسے اسی سپرنگ نے اسے اچھال کر پھر سے دروازے پر پھینک دیا، مگر یوسف نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے فضلو کی انگلیوں کی پوروں سے چھواتے ہوئے بولا "تم اتنے شریف اتنے نیک اور اچھے آدمی ہو کہ میں تمہاری جھجک پر حیران ہو رہا تھا - یہ تمہارے وعدے کا انعام ہے"

فضلو کی پوروں کی جلن اب چبھن میں بدل گئی تھی، اس نے نوٹ کو پوروں

میں جکڑ لیا، اور اس ہاتھ کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے "سلام" کہا اور چلا گیا،
کوٹھری کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر دیکھا، لالٹین بجھ گئی تھی اور رئیس خانہ
اس کی کوٹھری کی طرح اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ فضلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے
اس نے کئی دنوں کے بھوکے کو پیٹ بھر کھانا کھلایا ہے۔ وہ اندر کھاٹ پر
لیٹ گیا، کچھ دیر تک اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑا رہا، پھر نوٹ کو جیب
سے نکال کر تکیئے کے نیچے رکھا اور نہایت اطمینان سے سو گیا۔

صبح دہ دیر تک سویا رہا، مریاں نے چائے تیار کرنے کے بعد اس کا شانہ
ہلایا اور وہ بھڑک کر اٹھ بیٹھا، اس نے اپنے سامنے مریاں کو دیکھا، پھر باہر نھنی
نھنی پھوار کی جھالر کے پار ٹین کی چھت تلے چولھے کے پاس شیرو کو بیٹھے دیکھا
جو مٹی کے پیالے میں چائے کو پھونکیں مار رہا تھا، اور پھر اس نے آسمان کے
ایک ٹکڑے کو دیکھا "ابھی تو سورج بھی نہیں ابھرا" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے
کہا۔

"سورج نہیں ابھرا!" مریاں نے طنز کی۔ رات کا غصہ شاید ابھی تک باقی تھا۔
"سورج بادلوں بادلوں میں جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کے
لئے ابھی پو بھی نہیں پھٹی۔ رات بھر کیا کرتے رہے ہو؟ چرمول بلیوں کی طرح کبھی
لحاف گھسیٹ رہے ہو، کبھی کھڑکی کے پٹ کھڑکا رہے ہو، کبھی دروازہ
کھل رہا ہے، کبھی باہر کی سیریں ہو رہی ہیں ـــ بہت تو نہیں کھا گئے تھے؟"

فضلو کی نظریں اس وقت بند کھڑکی پر جمی تھیں، اسے آہستہ آہستہ یاد آ رہا
تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر رئیس خانے کی طرف دیکھا تھا اور پھر کھڑکی بند

کئے بغیر باہر چلا گیا تھا۔ "یہ کھڑکی کس نے بند کی؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں نے" مریاں بولی۔

"کب؟" اس نے پوچھنا چاہا مگر نہ پوچھ سکا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں، کھڑکی کے صاف ستھرے فرش میں اسے جا بجا گڑھے نظر آنے لگے، مریاں سے اسے خوف آنے لگا: "مریاں" اس نے کہا "بات یہ ہے کہ تمہارے روٹھ جانے کی وجہ سے میں رات بھر اداس رہا۔ نیند نہیں آتی تھی"

"حرامزادہ" مریاں نے کہا، مگر کچھ اس انداز سے کہ فضلو نے اس گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا "میں روٹھی تھی تو تم بھی تو روٹھے تھے، تم نہیں سوئے تو میری آنکھ کب لگی۔ ذرا ادھر دیکھو"

تو وہ رات بھر جاگتی رہی ہے! ——— تو پھر اس کو سب کچھ معلوم ہے!

"ادھر دیکھو" مریاں نے دوبارہ کہا۔

اس نے مریاں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور سُوج رہی تھیں اور تھکی ہوئی تھیں، لیکن ان میں غم یا غصہ نہیں تھا، پیار کی روشنی تھی "آؤ، من جائیں" وہ بولی "دایاں ہاتھ ادھر لاؤ"

فضلو اطمینان سے مسکرایا، اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مریاں چیخ اٹھی "ارے، یہ تو دس روپے کا نوٹ ہے! یہ اتنے بہت سے روپے کہاں سے لائے ہو تم؟ ——— تنخواہ تو ابھی پرسوں ہی ملی تھی"

"صاحب نے بخشش دی" اس نے کہا "وہ ہماری خدمت سے بہت خوش ہے"

"بخشیش!" مریاں جیسے نشے میں بولی "جیتا رہے، پھولے پھلے، خوشیاں دیکھے ——— اور فضلو آج بڑا غضب ہو گیا۔ صاحب کے لئے مکھن کہیں سے نہیں ملا۔ سب کہتے ہیں رات اچانک سردی پڑی اس لئے دہی نہیں جما، بلونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بڑی شرم آ رہی ہے"۔

"کوئی بات نہیں" ہمارا صاحب قلندر آدمی ہے، اور سور کی بچی صبح بھی ہو چکی اور ابھی ایک پیالہ تک کی توفیق نہیں ہوئی تجھے، کچھ شرم ہو تو ڈوب مرو چائے کی پیتلی میں ——"

مریاں ہنس دی، اس نے بھی فضلو کی گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا، وہ جھکی اس کے ایک گال کو چوما اور پھر اپنا گال آگے کر دیا، فضلو نے پہلے تو اسے ہلکا سا طمانچہ مارا، پھر جب وہ سنجیدہ سی بن کر ہٹنے لگی تو فضلو نے اسے جکڑ لیا، اور اتنے پیار کئے کہ باہر شیر و چائے پینا تک بھول گیا۔

چائے کا طشت لے کر وہ رئیس خانے کو چلا، برآمدے میں پہنچ کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی، بڑی مشکل سے سنبھلا، اور اندر کچھ یوں جھینپا جھینپا گیا جیسے اپنے چہرے پر سے رات کی کالک دھونا بھول گیا ہے۔ لیکن یوسف نے اس سے رات کی کوئی بات نہ کی، خوشگوار موسم کا ذکر کیا اور اس سے کہا "ذرا یہ دوربین لے کر سکیمرادر سون کے نظارے دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی بڑی بڑی لینڈ سکیپ پینٹنگز بکھیر دی گئی ہیں ہر طرف ——— یعنی بڑے اچھے نظارے ہیں" فضلو دوربین لے کر باہر صحن میں آ گیا نیچے وادی میں جھیل کے کنارے کے درختوں کے عکس دیکھتا رہا پھر چنڈ اور کوٹلی اوگالی کے دیہات پر سے ہوتا ہوا آنگہ پہنچا، جہاں سفید سفید دو منزلہ مکان آسمان کے ابر آلود ہونے کے باوجود چمک رہے تھے، لمبائی میں بکھرے ہوئے

انگہ سے اُتر کر وہ شکر کوٹ اور سرال پر آیا۔ اور ان دیہات کے جنوب میں بکھرے ہوئے سبزہ زاروں میں جابجا گھنے توتوں میں گھرے ہوئے کنوؤں اور ان کے گرد ترشی ہوئی کیاریوں کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا، وہاں سے وہ سون کے مرکزی قصبہ نوشہرہ کی طرف گھوما، شہر سے زیادہ ہسپتال اور سکول کی عمارتوں پر رکا۔ پھر تھانے پر آیا۔ کالی بھجنگ عمارت ایک پرانے قبرستان کے سرے پر شاید پرانی قبروں ہی میں اپنی بنیادیں گاڑے کھڑی تھی، پھر وہ سبھرال، کفری اور کرڈھی پر سے ہوتا ہوا اچھالی پہنچا، یہ گاؤں جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر آباد تھا، یہاں گاؤں کے ارد گرد کنوؤں کے آس پاس توتوں کے چھتناروں تلے بہت سے خیمے تنے ہوئے تھے، ان خیموں میں ایسے میدانی رئیس بستے تھے، جو سکیسر کی بلندیوں پر آنا برداشت نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ سکیسر پر مرغی کا ایک انڈا چار آنے میں اور گلاب کا ایک پھول آٹھ آنے میں ملتا تھا، اور ڈاک بنگلے کے مالی کی غیر حاضری میں تو اس کی بہن بہشتو نے کئی لوگوں سے ایک پھول کا ایک روپیہ تک وصول کیا تھا۔ فضلو فوراً پلٹا اور دوربین کو سکیسر کے بنگلوں پر گھمایا، صحن سے ڈاک بنگلہ نہایت صاف نظر آتا تھا مگر دوربین کی وجہ سے وہ ابھی ڈاک بنگلے تک نہیں پہنچ پایا تھا، درخت نہا کر نکھر گئے تھے ننھی ننھی پھوار نے پتوں پر موتی ٹانک دیئے تھے اور رئیس خانے کے درختوں کے پتے تو فضلو کو صاحب کے بٹوے کے برابر بڑے نظر آرہے تھے، پھر ایک دم گھومتی ہوئی دوربین ڈاک بنگلے پر جا کر رک گئی، باغیچے میں بہشتو پھول توڑ رہی تھی، وہ اسے اتنی قریب محسوس ہوئی کہ اس کا جی چاہا اس سے بات کرلے —— اس کا لباس علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا، مگر پھوار کی وجہ سے وہ جگہ جگہ اس کے جسم سے چمٹ گیا تھا۔ اور بھری بھری

آپے سے باہر جوانی کے بڑے کافرانیسے اور بڑی ظالم نوسیں نمایاں تھیں، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، شاید وہ کچھ گنگنا رہی تھی، اور ایک درخت پر بیٹھے ہوئے لال چونچوں والے سبز طوطے گردنیں یوں جھکائے بیٹھے تھے جیسے ہشتو کو دیکھ رہے ہیں۔ اور دیکھ نہیں رہے تو سن ضرور رہے ہیں۔

"بھئی تم تو دوربین ہی کے ہو رہے ہو۔" اندر سے آواز آئی، اور وہ چونکا چائے کے برتن واپس پہنچا کر اور خود جلدی جلدی چائے پی کر وہ باہر سڑک پر آگیا، روزانہ اس وقت باہر جانا اس کا معمول تھا، مرغیاں خریدنا تھا۔ انہیں ٹٹولتا تھا، انہیں ہاتھ پہ تولتا تھا، ان کے دام چکاتا تھا، اور پھر انہیں گھر لا کر اور ذبح کر کے اُن کی چمڑی ادھیڑتا تھا۔ لیکن آج وہ کچھ اور خریدنے نکلا تھا۔ زندگی میں یہ اس کا پہلا تجربہ نہ سہی، پہلا عملی تجربہ ضرور تھا۔ شادی سے پہلے اس نے جی ہی جی میں گاؤں کی ہر خوش رو لڑکی سے عشق کیا، چوراہوں پہ بیٹھا، الغوزے بجائے۔ ہیر گائی، لیکن اس نے آج تک کسی لڑکی کا پلو نہیں کھینچا تھا، کسی کے کنکر نہیں مارے تھے، کسی کے قریب سے گزرتے ہوئے آہ نہیں بھری تھی، بس سب کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا اور بہت دنوں تک سب کے لئے ترس ترس کر جیا تھا، اور پھر اسے مرباں مل گئی جسے دیکھ کر وہ ساری دنیا کا حسن بھول گیا تھا، اپنے نیلی کی اس لڑکی تک کا حسن بھول گیا تھا جس کے بارے میں سوچتے سوچتے اس نے خوابوں میں اس کے لئے کولہو چلائے تھے اور نمبردار کے گھر سے رسوں اور ناریل کی بوریاں چوری چوری اس کے ہاں ڈھو دلایا تھا۔ مرباں سب سے مختلف تھی، بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پہ کاجل کی وہ مدھم سی لکیر آج پانچ چھ سال سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دھلی تھی۔ اس کے چہرے کی لالی اور گالوں کی شفق کو سمیٹے ٹکڑے

تک نہیں چھین سکے تھے، اور اس کے بالوں کی لہریں لکڑی کی بے رحم کنگھیوں میں سینکڑوں بار کسے جانے کے باوجود نہیں مٹنے پائی تھیں، مرباں کے بارے میں اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر وہ بات بات پر گالی نہ بکتی، تو اس کی ٹکر کی کوئی عورت نوابوں تک کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ آج پانچ چھ برس تک مرباں سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور آج وہ بشتو کے پاس جا رہا تھا —— اور اگر بشتو نے اپنے بھائی سے کہہ دیا —— اس کے بھائی نے کسی افسر سے کہہ دیا —— اور پھر کسی نے اگر مرباں سے کہہ دیا —— تو؟ —— تو کیا! بشتو اسے تو نہیں چاہیے تھی۔ اور —— لیکن سامنے کھڑی ہوئی بشتو کی آواز نے اس کے ڈوبتے ہوئے ارادے کو سنبھالا دیا: "کہاں چلے فضلو بھائی، مرغیوں کی تلاش میں ہو گے۔ یہ صاحب کیسر پر مرغیوں کی نسل ختم کر کے ہی دم لے گا!" —— وہ زور سے ہنسی، اس ہنسی میں گھنٹی کی سی ٹنٹناہٹ تھی۔ ایسی ہنسی جو صحت مند خون کے کھولاؤ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

"پھول چاہئیں؟" اس نے پوچھا: "ارے حیران کیوں کھڑے ہو؟ میں نے کبھی تم سے قیمت لی ہے جو آج لوں گی، مرباں اپنی سہیلی ہے۔"

میرپھیر سے بات کرنے کی ان گنت تجویزیں فضلو کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئیں۔ اس کا رنگ فق ہو گیا، ہونٹ اچانک خشک ہو گئے آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب ہو گئیں، اور وہ پاگلوں کی طرح نہایت بھونڈے طریقے سے بولا: "بشتو۔"

"کہو!"

"رات صاحب کے پاس گزارو گی؟ —— سو روپے ملیں گے" اور وہ

خیال ہی خیال میں زمین کے اندر دھنسنے لگا ——— اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ سکیسر کی چوٹی پر کھڑا ہے یا جھیل کی تہ میں بیٹھا ہے، اور آسمان سے پھوار گر رہی ہے یا کنکریاں برس رہی ہیں۔

بختو نے اس کے ہاتھ کو اس تیزی سے جکڑا کہ انگلیوں کی ٹیس نے اس کے سب حواس کو چوکنّا کر دیا۔ وہ سرگوشی میں بولی "کس وقت؟"

ارے!

فضلو جھیل کی تہ سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کے باغیچے میں آ گیا۔

"عشا کی نماز کے بعد" وہ بولا۔

"کہاں ملو گے؟"

"سڑک سے ادھر پرانے کھوہ کے نیچے۔"

"سو ہی چکیں گے نا؟"

"ہاں ہاں، پورے سو۔"

"بھیّا کو خبر نہ ہو۔"

"مجھے کیا پڑی ہے۔"

"آہستہ بولو۔"

"تم بھی ذرا آہستہ بولو۔"

کچھ دیر رک کر وہ مسکرائی اور بولی "صاحب آج پانچ چھ دن سے تمہارے وہاں ہے۔"

"ہاں"

"مریاں نے کتنے سو کمائے ہیں؟"

ایک دم جیسے آسمان ٹوٹ پڑا اور سکیسر بیٹھ گیا۔ "سور کی بچی۔" اس نے بشتو کو گالی دی اور مٹھیاں بھینچ کر اور نچلے ہونٹ کا ایک حصہ دانتوں تلے دبا کر بھاگا۔

"فضلو بھائی" بشتو کی آواز آئی۔

مگر وہ بھاگا چلا گیا، ریس خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی رفتار اور تیز ہو گئی، اور پھر بہت نیچے سڑک کے بڑے موڑ پر چھپتے ہوئے بادلوں میں اڑ گیا، وہ کافی دیر کے بعد واپس آیا، نہایت گنجان بوندیں گر رہی تھیں اور تیز ہوا نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی تھی، نیچے وادی کا ایک حصہ دھوپ کی وجہ سے سنہری ہو رہا تھا، مگر سورج کا کہیں نشان نہ تھا، فضلو ٹھٹھرا اور بھیگا ہوا کوٹھری میں آیا، صاحب کو کھانا کھلانے کے بعد پھر کوٹھری میں آ گھسا اور کھاٹ پر لیٹ رہا مریاں وقت سے پہلے اس کے لئے چائے بنا لائی "آج تم کچھ سست سے لگ رہے ہو، موسم ایک دم بدلا ہے نا ——— چادر اوڑھ کر باہر جایا کرو، سکیسر کا ساون تو سوان کے اسوج کے برابر ہوتا ہے، لو چائے پیو ——— اٹھو"

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا، پھر چادر اوڑھ کر صاحب کو چائے پلانے گیا اور واپس آ کر کھاٹ پر پڑ رہا، صاحب کو شام کا کھانا کھلانے گیا، اور پھر آ کر کھاٹ پر گر پڑا، اس نے صاحب سے کوئی بات نہ کی۔ اور صاحب نے بھی اس کی سنجیدگی کو نہ توڑا۔ جیسے اسے معلوم تھا کہ اس سنجیدگی کی تہ میں کچھ ہے، سکیسر کی مسجد میں عشا کی نماز پڑھ کر جب نمازی باتیں کرتے ہوئے ریس خانے کے

قریب سڑک پر سے گزرے تو فضلو چونکا، مگر پھر چادر سے منہ تک چھپا لیا، اندر اس کی آنکھیں کھلی تھیں، اور کھدر کی چادر میں سے چراغ کی بہت دھندلی روشنی اسے بہت ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی، مریاں اور شبو آج اطمینان سے سو رہے تھے، مریاں نے دیر تک اس کا سر دبایا تھا، اور پھر اس کی کھاٹ پر سے یوں دبے پاؤں اٹھی تھی جیسے وہ سو گیا ہے، مریاں پر اسے بہت پیار آنے لگا۔ پھر اچانک اس کے جی میں آئی وہ کوٹھری سے نکل کر سیدھا ڈاک بنگلے میں پہنچے اور وہاں باغیچے میں کھڑے ہو کر بشتو کو ایسی ایسی گالیاں دے جو آج تک نہ کسی نے سنیں، نہ دیں، نہ سوچیں، —— وہ چادر لپیٹے چپکے سے باہر آگیا۔

رئیس خانے کی کھڑکی روشن تھی، وہ روشنی سے کترا کر سڑک کی طرف جانے لگا۔ کہ پرانے کھوکے تنے کے پاس کچھ ہلا اور آواز آئی "فضلو بھائی"۔

وہ وہیں گڑ گیا، اس کے دماغ میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔ گالیاں اس کے دماغ سے نکل کر اس کے گلے میں ایک دوسرے پر سوار ہو کر بیٹھ گئیں، اور اس کی زبان کی نوک تپ گئی۔

بشتو اس کے قریب آگئی "میں تو بھیگ گئی فضلو، اتنی دیر سے تو بیٹھی ہوں، نماز تو کب کی ہو چکی"

فضلو وہیں جما رہا۔

"اور فضلو مجھے بخش دو، مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ذرا سے مذاق پر تمہیں اتنا تاؤ آجائے گا۔ میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔ اور ——"

فضلو نے اس کا ٹھنڈا بھیگا ہوا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ رئیس خانے

کی طرف چلا، برآمدے میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے پلٹ کر کوٹھری کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک چھری نظر آ رہی تھی، وہ چراغ بجھانا بھول گیا تھا، اور یہ چھری جیسے اس پر ہنس رہی تھی، پھر وہ ایک تیز چھری بن گئی، پھر سمٹ کر مریاں کی غصّے اور دکھ سے بھری ہوئی آنکھ بن گئی، اور جب فضلو نے اپنی آنکھیں ملیں تو وہ پھر سے چھری بن گئی۔ اس نے بشنو کو ہاتھ سے گھسیٹ کر تیزی سے اندر جانا چاہا مگر بشنو اپنا ہاتھ کھینچ کر آہستہ سے بولی "پورے سو ہی ملیں گے نا؟"

"پورے سو" فضلو پہلی بار بولا، اور اسے اندر لے گیا۔

یوسف گھٹنوں کے ارد گرد بانہیں لپیٹے سر کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا، آواز سن کر چونکا۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں تک میں پھیل گئی، وہ تیزی سے اٹھا، کھڑکی بند کر دی، فضلو کو باہر برآمدے میں لے گیا۔ اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا "تم بہت اچھے آدمی ہو فضلو، میں جیتے جی تو تمہارے احسان کا بدلہ شاید ہی اتار سکوں، یہ لو ایک سو کا نوٹ، یہ بشنو کے لئے اور یہ دس روپے —— یہ تمہارے ہیں —— کل بتا حساب چلے گا —— میں برا آدمی نہیں ہوں فضلو —— یہ دنیا بری ہے، یہ سارا ان کا برا ہے —— سمجھے؟ —— خدا حافظ"

فضلو کی پور دن میں صبح والی چل سجاگ اٹھی، اس نے دونوں نوٹ اپنی مٹھی میں چھپائے اور کوٹھری میں آ گیا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا، دیا بجھانے کے باوجود اسے نیند نہ آئی، مریاں کی سانسوں تک کی آواز سے اسے وحشت ہو رہی تھی، شیرو کے کھٹولے کی

ایک ذراسی آواز سے وہ لرز اٹھتا تھا، اس کی آنکھیں دُکھنے لگیں، زبان بڑتک خشک ہوگئی، سانس تک مشکل سے آنے لگی، ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا، صبح قریب تھی، وہ رئیس خانے کی طرف لپکا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا، ساتھ والے کمرے میں گیا۔ وہاں ٹین کا ایک دیا جل رہا تھا اور بہشتو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، فضلو کے اندر جاتے ہی وہ بھڑک کر اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بولی "یہ کیسا صاحب ہے فضلو، یہ تو کچھ انوکھا صاحب ہے۔ میں نے تو یہ رات کانٹوں پر گزاری ہے، ایسا لگتا تھا۔ جیسے ہاتھ پیر کاٹ کر گھورے پر ڈال دی گئی ہوں، سو روپے کا سودا۔ اور ہوا یہ کہ تمہارے جانے کے بعد اس نے بڑے پیار سے میرے لئے یہ بستر بنایا، پھر مجھے یہاں بیٹھ جانے کو کہا، لالٹین وہ سامنے رکھ دی، اور مجھے پاگلوں کی طرح ٹکر ٹکر بھوکی بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے گھبرا کر رُخ بدلنا چاہا تو بولا۔ "نہیں، یونہی بیٹھی رہو۔ میں تمہیں دیکھوں گا، میں صرف دیکھوں گا تمہیں۔ تمہیں نیند آنے لگے تو سو جانا، میں تمہیں سوتا دیکھوں گا۔ تم رونا چاہو تو رو دینا، میں تمہاری بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھوں گا۔ بس میں تو صرف دیکھوں گا تمہیں۔" اور فضلو، وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا، میں تھک کر لیٹ گئی جب بھی وہ مجھے تکتا رہا۔ میری ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ پھر جب کھلی تو وہ اسی طرح میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی، بس میں آنکھیں بند کئے پڑی رہی، اور وہ سامنے بیٹھا رہا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، پھر جب پہلے مرغے کی بانگ سُنائی دی تو لالٹین اٹھا کر ادھر کمرے میں چلا گیا، اور میں جب سے

نہیں سو پائی، جانتی تھی کہ ابھی صبح ہو جائے گی، میرا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے گھٹنوں تلے دبا کر خوب خوب پیٹا ہے، اور اس نے مجھے چھوا تک نہیں فضلو۔"

فضلو کی حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، صاحب اس کی نظروں میں اچانک ان ولیوں کی صورت اختیار کر گیا جو لڑکوں لڑکیوں سے محبت کر کے خدا کی محبت تک پہنچے، گاؤں کا مولوی علیم بھی اسے بالکل بے گناہ نظر آنے لگا، ممکن ہے وہ بھی خدا تک پہنچنے کی کوئی سبیل ڈھونڈھ رہا ہو ——— اور یہ صاحب! ———

اس نے ایک سو کا نوٹ بشنو کے زانو پر رکھ دیا،

"سو کا ہے نا؟" اس نے دیئے کی طرف جھک کر نوٹ کو الٹا پلٹا۔

"پورے سو کا ہے" وہ بولا "جاؤ، پو پھٹنے ہی والی ہے۔"

"تمہارا حصہ؟" بشنو نے شاید تجربے کی بنا پر پوچھا۔

"جاؤ۔" فضلو گھبرا کر بولا۔

بشنو اٹھی اور کراہی۔ پھر ایک لمبی انگڑائی لی۔ اٹھتے ہوئے ہاتھ تیزی سے نیچے گرائے اور رانوں پر چٹاخ سے مارے، الٹے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اس نے دوپٹہ یوں احتیاط سے لپیٹا جیسے تہجد پڑھنے چلی ہے، وہ بولی "تم کل والی بات سے خفا تو نہیں؟"

فضلو نے نفی میں سر ہلا دینا کافی سمجھا۔

"میں تو نوکر ہوں تمہاری جب چاہو بلا لینا" اور وہ کمرے سے باہر

نکل گئی -

فضلو بالکل ہلکا پھلکا ہو کر وہاں سے نکلا - اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، صاحب نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ بھشلو نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا، اس نے تو بھشلو کو صرف دیکھا تھا - اور عورت کو دیکھنا کوئی نہیں۔ خود فضلو نے بھشلو کو کئی بار دیکھا تھا - دیکھنے میں کیا برائی ہے ـــــ وہ کوٹھری میں واپس آ کر بڑی گہری نیند سو گیا -

صبح اسے مریاں نے جگایا - "یہ دیر دیر تک سونے کی کیا عادت ڈال رہے ہو؟ چوکیدار دل کو یہ زیب نہیں دیتا" اس نے بڑے پیار سے فضلو کو سمجھایا۔ پھر جب وہ صاحب کے پاس چائے لے گیا تو وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا، اور کچھ گنگنا رہا تھا، آج اس کے چہرے پر بہت رونق تھی، اور اگرچہ آنکھیں تھکی تھکی تھیں مگر اس تھکن میں بھی ایک کیفیت تھی، فضلو نے اسے نہایت عقیدت سے دیکھا، دونوں مسکرائے، اور صاحب بولا "معلوم ہوتا ہے آج دھوپ نکلے گی، بادل بھاگے پھر رہے ہیں"

"جی ہاں" فضلو نے اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ مارے عقیدت کے اس کا گلا بھرا آ رہا تھا -

چائے پی کر وہ پھر کسی نئی عورت کی تلاش میں نکل گیا - اور نہایت آسانی سے سرائے کے بھٹیارے کی بیوی سے معاملہ طے کر لیا، وہ خوبصورت تو نہیں تھی - مگر اس کی شخصیت ایسی زوردار تھی کہ بڑی بڑی حسین عورتوں کے مجمعے میں بھی سب پر چھائی رہتی تھی، اور اس کے ہونٹوں میں پکے پھلوں کی سی

دعوت تھی ـــــ فضلو نے دن بھر اطمینان سے دوسرے کام کئے، رات کو وہ پرانے کھو تلے آنکلی، اسے رئیس خانے تک پہنچایا۔ کوٹھری میں آکر سو رہا، ٹھیک وقت پر آنکھ کھلی۔ دبے پاؤں رئیس خانے تک پہنچا، لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں دیا روشن تھا۔ اور جوان بھٹیارن پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، فضلو کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔

"کیا بات ہے؟" فضلو نے اسے تسلی دینے کا ارادہ کیا۔

"بات تو کوئی نہیں فضلو" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "اور دکھ کی بات بھی یہی ہے کہ کوئی بات ہے ہی نہیں، صاحب نے تو رات بھر مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا، بس بیٹھا دیکھتا رہا دیر تک، کہنے لگا بس میں تمہیں دیکھوں گا۔ میں نے صرف دیکھتے رہنے کے لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ سونا چاہو تو سو جاؤ، مجھے تو بس دیکھنا ہے ـــــ"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" فضلو نے پوچھا۔

وہ اور زور سے روتے ہوئے بولی "روپے جو نہیں ملیں گے، صرف دیکھنے کے کون دیتا ہے سو روپے۔"

فضلو نے سو روپے کا نوٹ بھٹیارن کو تھما دیا۔ وہ پہلے تو منہ کھولے سو روپے کے نوٹ کو دیکھتی رہی، پھر آنسو پونچھے اور چپکے سے باہر چلی گئی۔

فضلو دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے دیا بجھایا اور یوسف کے کمرے میں آیا۔ وہ سو رہا تھا، فضلو کو اس کے چہرے کے اردگرد ایک ہالا نظر آنے لگا، اس کے ماتھے میں سے لالٹین کی سی روشنی نکل رہی تھی،

"کتنا اچھا ہے میرا صاحب ـــــ کتنا پیارا ہے ـــــ کتنا نیک ہے ـــــ!
ـــــ اللہ یہ ساون کبھی ختم نہ ہو ـــــ اللہ یہ جھڑی کبھی نہ رکے ـــــ
اللہ صاحب کبھی یہاں سے نہ جائے" ـــــ وہ چپ چاپ باہر آگیا۔
آج وہ نئی عورت کے لئے باہر سڑک پر آیا ہی تھا کہ ایک دم بادل پھٹ پڑا اور سڑک پر جاتی ہوئی ایک عورت گھبرا کر پرانے کھوتلے آگئی، وہ کوٹھڑی کی طرف بھاگنا چاہتا تھا مگر اس عورت کو دیکھ کر اس نے قسمت آزمائی کی ٹھانی، پتلی دبلی سی تھی مگر ناک نقشہ ایسا کہ معلوم ہوتا تھا چینی کی گڑیا میں جان پڑ گئی ہے۔
وہ اس کے پاس گیا" کہاں جانا ہے بہن؟"
"میانوالی جانا ہے" وہ پوٹلی کو دامن تلے چھپاتے ہوئے بولی" وہاں میرا گھروالا جیل میں ہے، ملاقات پہ جارہی ہوں"
"آج رات یہیں رہ جاؤ" فضلو نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کہا۔
"کیا؟" عورت نے حیرت سے پوچھا۔
"میں کہہ رہا ہوں، رات ہی کی تو بات ہے، یہیں میرے پاس رہ جاؤ، ایک صاحب آیا ہوا ہے، رات کے سو روپے دیتا ہے"
عورت تن کر کھڑی ہوگئی، پوٹلی نیچے گر کر ایک طرف سے کھل گئی اور اس میں سے دیہاتی بسکٹ ـــــ گوگڑے ـــــ جھانکنے لگے، اس نے چلا چلا کر فضلو کو اتنی بہت سی گالیاں دیں کہ وہ وہاں سے گھبرا کر بھاگا ـــــ
"اپنی ماں کو لے آ ـــــ اپنی بہن کو بلا لا ـــــ اپنی بیوی سے کہہ ـــــ"
دور تک اسے عورت کی آواز سنائی دیتی رہی، وہ سڑک پر سے بڑی پگڈنڈی

اور بڑی پگڈنڈی پر سے چھوٹی پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا، معلوم ہوتا تھا عورت کی آواز اور بادل کی گرج اور موسلا دھار بارش اس کے تعاقب میں ہیں، اس کا لباس اس کے جسم سے چپک گیا، مارے ٹھنڈ کے دانت بجنے لگے، ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے اور وہ بھاگتا چلا گیا، اسے ڈر تھا کہ اگر مسافر عورت کی آواز کو مریاں نے سن لیا، اور مریاں نے اسے بھاگتا دیکھ لیا تو کیا ہوگا ——"

آخر وہ ایک بنگلے کے پہلو والی کوٹھریوں میں ایک کوٹھری کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس طرف بھاگا، اندر ایک نوجوان عورت بیٹھی مٹھی بھر دال کو چنگیر میں پھیلائے اس میں سے کنکریاں چن رہی تھی، فضلو کو دیکھتے ہی بولی "پھنس گئے بارش میں؟"

"ہاں" اس نے کہا اور چوٹے اور چادر کو نچوڑنے لگا۔

"بیٹھ جاؤ" عورت بولی۔

وہ بیٹھنے کی جگہ منتخب کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ادھر چولھے میں کچھ آگ ہو گی" وہ بولی۔

فضلو چولھے کے پاس جا کر بیٹھ گیا، بارش اسی شدت سے ہو رہی تھی۔

لڑکی کا چہرہ عام سا تھا، مگر اس کے ہونٹوں کے گوشے بڑے پیارے تھے۔ بھرے بھرے گالوں میں پھنسے ہوئے اور گہرے۔ بات کرتی تھی تو اس کے ایک گال پر دو گڑھے بنتے اور مٹتے رہتے تھے، وہ بولی "تم رئیس خانے کے چوکیدار ہو نا"؟

"ہاں" اس نے حیرت سے کہا اور پھر سوچا۔ یہ تو بہت بری بات ہوئی، یہ تو مجھے پہچانتی ہے۔

"تم یہاں کیا کرتی ہو؟" فضلو نے پوچھا۔

"نوکرانی ہوں۔ بیگموں کے جسم دباتی ہوں رات کو ——— دس روپے اور روٹی ——— کٹ رہی ہے۔"

"اکیلی؟"

"ہاں۔ کوئی ہے ہی نہیں، سب ایک ایک کرکے مرتے چلے گئے۔ ماں بہیں پچھلے جمعے کو مری ہے، کفن بیگم نے دیا تھا" ——— اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور وہ دال میں سے کنکریاں چننے کے بجائے چہرے پر سے آنسو سمیٹنے لگی۔

فضلو کو یہ عورت بہشتو اور بھٹیاران سے کچھ الگ سی معلوم ہو رہی تھی، وہ اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت کوسا کہ خواہ مخواہ مولوی بنا پھرتا رہا اور اُسے آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ سکیسر پر وہ کون سی عورتیں ہیں جو آسانی سے خریدی جا سکتی ہیں، مسافر عورت کی گالیاں ابھی تک اس کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں، وہ دیر تک لکڑی کے ایک ٹکڑے سے چولھے میں بجھتے ہوئے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا، پھر جب کافی دیر کے بعد بارش تھمی تو وہ اٹھا۔

"جاتے ہو؟" عورت نے پوچھا،

"ہاں۔ اب چلیں" اس نے کہا اور باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی اس نے اپنے آپ کو بڑا بزدل محسوس کیا، اگر وہ یہاں سے کچھ کہے بغیر پلٹ گیا تو پھر اور کون ہے سکیسر بھر میں، کیا وہ مریاں سے جا کر کہے گا؟ ——— اس نے وحشت میں اپنے بالوں کی ایک لٹ یوں کھینچی جیسے جڑ سے

اکھڑ لے گا، ——— تو کیا وہ یہاں سے ناکام پلٹ جائے گا۔ اور اس کے صاحب کی راتیں اجڑ جائیں گی اور اس کے روز کے دس روپلے، مہینے کے تین سو روپے الگ مارے جائیں گے ——— وہ گھوم کر پھر دروازے پر آ گیا۔

"کچھ بھول گئے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں"

"کیا؟"

"ایک بات کہنا بھول گیا"

"کیا بات"

"ایک بات ہے"

"کیا بات ہے؟"

"ذرا سی بات ہے" وہ ڈرتے ڈرتے بولا: "سو روپے ملیں گے"

"سو روپے!" عورت نے حیران ہو کر کہا "مگر کس بات کے؟"

"بس ایک رات کی بات ہے" فضلو نے بڑی جرأت سے کہا۔

عورت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو بھر گئے اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو اکٹھے بہت سے آنسو ایک دوسرے کے پیچھے چنگیر میں گرنے لگے، اور وہ جیسے گلگلوں کے بجائے آنسو چھننے لگی، پھر وہ چنگیر کو ایک طرف رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

فضلو شرمندہ ہو کر واپس چلا آیا۔ اس روز وہ سکیسر کے بنگلوں کے

چکر پہ چکر لگاتا رہا، بہت سی نوکرانیاں، چوکیدارنیاں، سبزی بیچنے والیاں اور مسافر عورتیں اسے دکھائی دیں مگر وہ کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ صاحب کے سامنے بھی نہ گیا۔ شیرو نے بڑی مشکل سے ایک ایک کرکے برتن صاحب تک پہنچائے، اور پھر شام کو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی عورت سے ضرور بات کرے گا، آخر ایسی بزدلی بھی کیا ——— وہ یہ فیصلہ کرکے سڑک پہ آیا تو اسے ایک طرف بنگلے والی نوکرانی دکھائی دی، وہ اس کے پاس آئی، وہ اسی طرح رو رہی تھی، اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ہونٹ نیلے ہو رہے تھے، اور ہونٹوں کے گوشوں میں تھرتھری تھی، اس نے فضلو کی طرف دیکھے بغیر رکتے رکتے کہا "آؤں گی"۔

فضلو کا اچھلنے کو جی چاہا، سرگوشی میں بولا "تو پھر عشا کی نماز کے بعد بیگموں کے جسم دبا کے وہاں اس کھوتلے آجانا۔ آجاؤ گی نا؟"

"آؤں گی" وہ بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرے جا رہے تھے۔

عشا کی نماز کے بعد وہ سچ مچ کھوتلے آگئی۔ وہ اس وقت بھی رو رہی تھی، اور جب وہ اسے صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر برآمدے میں آیا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ جب بھی رو رہی تھی۔

منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھلی، وہ رئیس خانے میں گیا، یوسف لالٹین جلائے سو رہا تھا، دوسرے کمرے میں دیا جل رہا تھا، اور وہ بستر پہ مزے سے سو رہی تھی، فضلو مسکرایا، اس نے عورت کے پاؤں کا انگوٹھا آہستہ آہستہ ہلایا۔ وہ جاگ اٹھی، پہلے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک سکون بھری انگڑائی لی اور مسکرا کر بولی "میں تو ایسی ڈر رہی تھی، ایسی ڈر رہی تھی ——— خواہ مخواہ ڈرتی رہی۔

اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس دیکھتا رہا اور دیکھنے میں کیا پڑا ہے۔"

مسکراتے ہوئے اس نے چادر اوڑھی، مسکراتے ہوئے اس نے سو کا نوٹ لیا، مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی اور فضلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے تین سو روپے چولھے میں جھونک دیئے ہیں، تین سو روپے ——— پندرہ بیسیاں! ——— جن سے وادی میں ایک کچا گھروندہ بن سکتا ہے اور اگر تین سو اور مل جائیں تو ہل اور بیل خریدے جا سکتے ہیں یا دال گڑ کی ایک دکان کھل سکتی ہے ——— اور پھر وہ کچھ کہتا تو ہے ہی نہیں کسی سے، بس دیکھتا ہے، جانے کیا دیکھتا ہے، اپنی مریم کی صورت دیکھتا ہے یا اللہ کی قدرت دیکھتا ہے، بس صرف دیکھتا ہی ہے نا۔ کچھ چھین تو نہیں لیتا، کوئی خرابی تو نہیں کرتا ———!

وہ دوسرے کمرے میں آگیا، صاحب سو رہا تھا، وہ اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اپنی کوٹھری کی طرف آہستہ آہستہ آیا۔ اور جب دروازہ کھولا تو سامنے مریاں کھڑی تھی ——— وہ تیورا کر پیچھے ہٹا، اسے بڑے زور کا چکر آگیا، جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو کر کھولنے لگا۔

"کہاں گئے تھے؟" مریاں نے تلخی سے پوچھا۔

"صاحب کے پاس" اس کے دماغ میں قسم قسم کے بہانوں نے آفت مچا دی۔

"اس وقت کیوں گئے تھے؟" اس نے اسی تلخی سے پوچھا۔

"اس کے سر میں درد تھا" ایک بہانہ اس کی زبان پہ آگیا۔

"کیا روز اسی وقت اس کے سر میں درد ہوتا ہے؟" مریاں نے سختی سے

کہا: "تم آج تین چار دنوں سے جا رہے ہو۔"

فضلو نے دروازے کا سہارا لے لیا۔ اسے ایک اور بڑے زور کا چکر آگیا تھا، گھبراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ہاں کچھ ایسا ہی درد ہے، اسی وقت ہوتا ہے۔"

"اور یہ رئیس خانے میں سے ابھی ابھی نکل کر کون گیا ہے؟" مرباں کے لہجے میں چھریاں تھیں۔ "تم کھو گئے یہ صاحب کے سر کا درو تھا۔"

فضلو نے محسوس کیا جیسے اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر گر پڑے گا اور اس کا بھیجا تالو کو پھاڑ کر اوپر اڑ جائے گا، لیکن اس نے ایک دم بڑے زور کا کھسیانا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "چلو تمہیں ساری بات بتا ہی دوں، تم سے کیا پردہ۔ بالکل ذرا سی بات ہے، کوئی ایسی ویسی بات نہیں، راستہ دو۔"

وہ اندر کھاٹ پر بیٹھ گیا، شیرو سو رہا تھا، چراغ کی لو بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، مرباں اپنی کھاٹ پر بیٹھنے لگی تو فضلو نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ "ادھر میرے پاس بیٹھو، تین دن سے سوٗر کی بچی نے ایک چمی تک نہیں دی۔"

"حرامزادے گالی بکتا ہے" وہ بولی۔ "اب بتا کیا بھید ہے راتوں کو اٹھ اٹھ کے جانے میں۔ تم سمجھتے ہو میں سوتی رہتی ہوں۔ آج بھی تمہیں باہر جاتا دیکھا تو کہا لاؤ ذرا دیکھوں تو یہ جاتا کہاں ہے، اور جو دیکھا تو ایک عورت اندر سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی، شور مچا دیتی پر تمہاری بدنامی کا ڈر تھا، صاحب نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟ کیا ہم کنجر ہیں؟ —— اور تمہارا کیا ہاتھ ہے اس میں؟"

"تم نہیں جانتیں" وہ بولا۔ وہ اندر سے گھبرا رہا تھا، اس کی نسیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں ویران ہو رہی تھیں، اس کی کنپٹیوں کی رگیں صاف تڑپتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ مگر جھوٹ موٹ کے اطمینان سے اس نے اپنی آواز ضرور سنبھالے رکھی، اس نے اپنا ایک بازو مریاں کی پیٹھ پر پھیلا کر اس کا شانہ پکڑ لیا اور بولا "یہ صاحب تو مجھے بڑا اللہ والا معلوم ہوتا ہے مریاں، یہ تو کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہے، سوچو تو، ایک جوان عورت اس کے سامنے رات بھر بیٹھی رہتی ہے، وہ جو چاہے اس سے سلوک کرے، پر وہ ہے کہ بیٹھا دیکھ رہا ہے عورت کو چھونا تک نہیں، صرف دیکھ رہا ہے، اور صبح سے پہلے ایک سو روپے دے کر اسے چلتا کرتا ہے، سن رہی ہو نا —— ایک سو روپیہ —— پانچ بیسیاں —— اور وہ صرف دیکھتا ہے"

فضلو نے محسوس کیا کہ مریاں کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

"سن رہی ہو مریاں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"اور یہ عزیز لالا کون ہے؟" مریاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

فضلو نے ہیر پھیر کی کوشش کی "بھئی اس میں بری بات ہی کونسی ہے! اب تم کتنی بار چشمے سے پانی لینے گئی ہو، کتنوں نے تمہیں دیکھا ہے، تو کیا میں ان سب کی آنکھیں نکال لوں؟ دیکھنے میں کیا رکھا ہے، اور صاحب عورتوں کو صرف دیکھتا ہے" —— اس نے نیس روپے نکال کر مریاں کی گود میں رکھ دیئے۔

مریاں نے نوٹوں کو نفرت سے نیچے گراتے ہوئے کہا "پر لاتا کون ہے عورتیں؟"

"بھئی کوئی بھی لائے، وہ کچھ کہتا تو ہے نہیں، چھوتا تک نہیں۔ تکتا ہے اور سو روپے نکال دیتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ آہستہ سے بولا "میں ہی لاتا ہوں۔"

مریاں نے فضلو کا ہاتھ اپنے شانے پر سے جھٹک دیا اور ایک دم رونے لگی، فضلو مریاں سے لپٹ گیا، اس کی پیٹھ اور گردن اور بالوں کو چوما، اور بولتا چلا گیا "مجھے خدا کی قسم مریاں۔ قرآن کی قسم —— مریاں مجھے تمہاری قسم، آج تک تین عورتیں لایا ہوں اور تینوں پاک صاف واپس گئی ہیں، ایک بہشتن ہے، ایک سرائے والی بھٹیارن ہے، ایک اُدھر ایک دکھنی بنگلے کی نوکرانی ہے۔ تینوں تین سو روپے لے گئیں اور وہ انہیں دیکھتا رہا، بس دیکھتا رہا، سُن رہی ہو؟ اس نے انہیں چھوا بھی ہو تو شیر و مرے، میں مروں، تم مر جاؤ۔"

مریاں نے آنسو پونچھے اور بولی "پتہ ہے تو کس کا بیٹا ہے؟"

فضلو ہنسا "تو کون کہتا ہے کہ میں اچھی بات کر رہا ہے، اور یہ بھی کون کہتا ہے کہ میں کوئی بری بات کر رہا ہوں۔"

"بری بات تو ہے ہی" مریاں نے کہا، مگر اب کے اس کا لہجہ اتنا سخت نہ تھا۔

"کیسے بری ہے؟" اس نے مریاں کو اپنی طرف کھینچ کر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سینے کا سہارا لے کر بیٹھے اور وہ بیٹھ گئی۔ "ایک عورت کو سامنے بٹھا کر کچھ

دیر دیکھتا ہے اور اسے سو روپے دے کر اپنے کمرے میں آ کر سو رہتا ہے۔ بتاؤ اس میں کون سی بری بات ہے؟"

مریاں خاموش رہی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ ہشتو کی جگہ پہلے دن سے تمہی کو وہاں بٹھا دیتا تو کچھ ایسی خراب بات نہ تھی۔"

مریاں اس کی گرفت سے چھوٹ کر وحشت سے قدم اٹھاتی شیرو کے پاس گئی اس کے منہ پر سے کھیس نوچ لیا اور بولی۔"اسے دیکھ رہے ہو؟"

شیرو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔ فضلو نے لپک کر اسے لٹایا، تھپکا اور پھر مریاں سے پوچھا۔"مجھے تم نے ایسا ہی کمینہ سمجھ لیا ہے؟ میرے چھ سال تمہارے سامنے ہیں۔ میں اپنی مریاں کو کسی دوسرے کے حوالے کروں گا؟ چوٹی پر سے نیچے چٹانوں پر نہ کود جاؤں گا اس کے بدلے؟ سؤر کی بچی۔ یقین ہی نہیں کرتی۔ مفت میں روز ایک سو روپیہ مل رہا ہو تو ہمارا بگڑے گا کچھ نہیں اور بنے گا بہت کچھ۔ اور ابھی ساون کے دس بارہ دن باقی ہیں، ہم آسانی سے ایک ہزار کما کر نیچے وادی میں جا سکتے ہیں اور عزت سے جی سکتے ہیں، وہ تمہیں صرف دیکھے گا۔ تم اسے دیکھتی رہنا۔ قصہ ختم۔"

لیکن مریاں پر تو ایک ہی وحشت سوار تھی، وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔ پھر زور زور سے پاؤں پٹخنے لگی "بے شرم، بے حیا" وہ چیختی رہی، اور دروازے میں بہت سی جھریاں اگ آئیں۔ باہر درختوں پر چڑیاں اور کوّے بولنے لگے تھے، اور بادل کہیں بہت دور گرج رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر

روتی رہی اور کہتی رہی "بیٹھے بیٹھے کنجر پنے پہ اتر آیا کمینہ کہیں کا - حرامزادہ - شرم نہیں آتی، جدتوں سمیت گھسا آ رہا ہے آنکھوں میں، آگ جلاتا ہے اور اوپر سے نیل گراتا ہے اور کہتا ہے آگ بجھ رہی ہے، کہتا ہے یہ آگ نہیں جل رہی یہ تو چاند چمک رہا ہے، اور مجھ سے کہہ رہا ہے اس کے پاس رات بھر رہنے کو ـــــ مجھ سے؟ ـــــ مجھ سے؟ ـــــ" وہ سینہ کوٹ کوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

فضلو شیرو کی کھاٹ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا، اس سے لپٹ جانا چاہا مگر وہ اس سے چھوٹ کر پرے جا گری، فضلو نے اٹھ کر اس کے بالوں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا، مریاں نے اس کی طرف امید سے دیکھا۔

وہ بولا "ارے وہ کچھ بھی نہیں کہتا"

مریاں پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فضلو بولتا رہا "سوّر کی بچی، تمہاری قسم کھا کر کہہ چکا ہوں کہ وہ تو چھوتا تک نہیں، بس دیکھتا ہے اور سو روپلے دے کر سو رہتا ہے - تو مانتی ہی نہیں"

اچانک مریاں تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی "اگر تم ایسے ہی بے غیرت ہو گئے ہو تو ایک شرط ہے"

"بتاؤ" فضلو بھی کھڑا ہو گیا۔

"میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہو کہ اس پر قائم رہو گے"

"پہلے شرط بتاؤ" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں رات صاحب کے پاس جاؤں گی - اگر اس نے مجھے چھو لیا تو پھر

میں تمہاری نہیں رہوں گی، پھر میں جہاں چاہوں گی چلی جاؤں گی۔" اس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہ تھا۔

فضلو نے بغیر کسی جھجک کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔" ماں لی تڑپا۔ پگلی تو سمجھتی ہے کہ تینوں کی تینوں جھوٹ بولتی ہیں۔ تو سمجھتی ہے میں ایسا ہی ذلیل ہو گیا ہوں؟"

"خدا کی قسم بھی کھاؤ" مریاں نے کہا۔

"خدا کی قسم بھی کھاتا ہوں" وہ ہنس کر بولا۔" ارے وہ تو مرف دیکھتا ہے —— اچھا میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کہو"

"اگر وہ تمہیں چھوئے تک نہیں۔ تو جب تک وہ یہاں ہے تم اس کے پاس جاتی رہو گی۔"

مریاں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔" قبول ہے۔"

وہ باہر جا کر چائے کا سامان کرنے لگی۔

"اور اس نے تمہیں دیکھا تک نہیں مریاں" اس نے باہر جا کر کہا۔" اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ تم ہو کون۔"

وہ خاموش رہی، وہ دن بھر خاموش رہی، اور جب شام کا کھانا بھی ہو چکا اور شیرو سو گیا تو وہ پہلی بار بولی۔" لے چلو۔"

اس کی آواز میں اتنے بہت سے کانٹے تھے جو فضلو کے کانوں کے پردوں میں ٹھنس گئے، مگر وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی،

پھر جب وہ صحن میں پہنچے تو مریاں نے آہستہ سے کہا "فضلو"۔

فضلو رک گیا "ہاں"۔

وہ بولی "شرط یاد ہے نا؟"

"یاد ہے" فضلو بولا "بے فکر رہو"

اور جب وہ مریاں کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر اور ایک سو دس روپے لے کر باہر صحن میں آیا تو پلٹ کر دیکھا، کھڑکی اور دروازہ دونوں بند ہو چکے تھے! روز ہی تو بند ہو جاتے تھے اس وقت! ——— وہ کوٹھری میں آیا، وہاں جیسے بھوت کونوں میں دبکے بیٹھے تھے اور چراغ کی لو میں ایک چڑیل ناچ رہی تھی، وہ شیرو کی کھاٹ پر بیٹھ گیا، پھر اسی کے پاس لیٹ گیا، شیرو کچی نیند میں تھا، بولا "کیا ہے؟ کون ہے؟"

"میں ہوں" فضلو نے پیار سے کہا "آج میں اپنے بیٹے کے پاس سوؤں گا"

شیرو مارے خوشی کے اس سے لپٹ گیا اور پھر اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے سو گیا۔ فضلو دیر تک اسی طرح اکڑا پڑا رہا، اور جب کمر دکھنے لگی تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، کتنی دیر تک وہ ٹہلا کیا، پھر چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کی۔ مگر پھر بھڑک کر اٹھا، چراغ جلایا اور اسے مریاں کی کھاٹ کے پائے پر رکھ کر بیٹھ گیا وہ اس کی لو کو دیر تک دیکھتا رہا۔ باہر شاید بادل کھل گئے تھے کیونکہ سفید چاندنی نے جھریوں میں جان ڈال دی تھی، وہ دروازہ کھول کر باہر آیا، مگر رئیس خانے کی طرف نظر اٹھتے ہی وہ بھاگ کر اندر آگیا، دروازہ بند کر کے وہ اس سے کچھ یوں لگ کر کھڑا ہو گیا جیسے اب وہ دنیا کی کسی طاقت کو اپنی کوٹھری میں نہیں گھسنے دے گا۔

وہ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا حتیٰ کہ پہلے مرغے نے کہیں دور بانگ دی، اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ اس کے لئے کھڑے رہنا مشکل ہو گیا، وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا، پھر بیٹھ گیا، پھر کھڑا ہو گیا، اور دھم سے دروازہ کھول کر رئیس خانے کی طرف بھاگا۔

ایک موٹر رئیس خانے کے پہلو سے نکل کر سڑک پر آ گئی، اور ناگن کی طرح تیزی سے نیچے وادی کی طرف تیر گئی، فضلو پاگلوں کی طرح سرپٹ بھاگا، رئیس خانے کا دروازہ بند تھا، اس نے دروازے کو گھونسوں سے کوٹ ڈالا۔ "مریاں" وہ چلایا۔ اور مریاں کے نام کے حروف بہت سی اونچی نیچی چیخیں بن کر پہاڑوں میں بجنے لگے، دور موڑ کاٹتی ہوئی موٹر کی روشنی اس کے فق چہرے پر سے گزرتی ہوئی غائب ہو گئی، اس نے موٹر کا پیچھا کرنے کے لئے نیچے گھاٹیوں کی طرف کو جانے کی سوچی، اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلا، لالٹین کی روشنی باہر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی صحن کے ایک حصے تک بہتی چلی گئی، دروازہ مریاں نے کھولا تھا۔

"آ پہنچے؟" مریاں نے کہا "تم شرط ہار گئے ہو حرامزادے؟" اس کی آواز بھرا گئی، ——— پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ لے گیا، اس نے تو مجھے بھنبھوڑ ڈالا، رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا، اس نے مجھے نوچا، کھسوٹا۔ اس نے میرے گال چاٹ ڈالے، اس نے ———"

مگر فضلو وہاں نہ تھا، وہ سر جھکائے کوٹھری کی طرف جا رہا تھا، ایک بدلی نے چاند کو چھپا لیا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی، اور کوٹھری میں شیرو رونے لگا تھا، مریاں اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ اور روتی اور بلکتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں

بولتی چلی گئی "تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوئے گا ہی نہیں۔ اور اس نے تو مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے، وہ تو پچھلے سا دن میں بھی میرے ہی لئے یہاں رُکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں مجھے دوربین سے دیکھ لیا تھا۔ وہ نواب کے بھی میرے ہی لئے آیا تھا، سن رہے ہو؟ سن رہے ہو حرامزادے؟ بھاگے کہاں جا رہے ہو؟

فضلو اب نہایت تیز تیز چل رہا تھا، اور مریاں اس کے پیچھے بھاگنے لگی تھی، وہ بولتی گئی "تم شرط ہار گئے، لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو، کہیں سے عزت آبرو بکاؤ ملے تو چٹکی بھر خرید کر رکھ لینا، کیونکہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات کمینے اور کنجر ہو گئے ہو؟ سمجھے؟ اور اب میں جا رہی ہوں، میں جہاں کہیں بھی جا رہی ہوں تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، میں کسی کی نہیں رہی تم نے میرا غرور توڑ دیا ہے، تم نے میرا سب کچھ لٹوا دیا ہے حرامزادے۔"

فضلو اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا گیا، تیورایا، اور پھر دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر دروازے کی طرف رینگا۔ اندر شبیر و زور زور سے رو رہا تھا، اور مریاں چیختے جا رہی تھی ——— "وہ دو مہینے اس ایک گھڑی کے لئے سکیسر پہ پڑا رہا، اور وہ "مریم مریم" کی رٹ لگانے اور رونے کے بعد مجھ پہ یوں جھپٹا جیسے کتا کچے گوشت پہ جھپٹتا ہے، کرائے کی موٹر کا اس نے رات ہی انتظام کر لیا تھا، اور وہ ابھی ابھی مجھے آخری بار جھنجھوڑ کر موٹر میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا ہے، اور تمہیں بخشش دے گیا ہے سو روپے کی، اور ایک ایسی مریاں کی جو اب اس کوٹھری میں نہیں گھسے گی، وہ نیچے وادی میں اتر جائے گی، وہ ادھر میدانوں میں چلی جائے گی،

اور جب بھوک کے مارے اس کا پیٹ زخم بن جائے گا تو کپڑے اتار کر راستے میں بیٹھ جائے گی ننگے مردوں کو لوگ پتھر مارتے ہیں پر ننگی عورتوں کو بستر دیتے ہیں اور روٹی کھلاتے ہیں، تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے ـــــــ"

آس پاس کے بنگلوں میں کتے مریاں کی چیخیں سن کر بھونکنے لگے تھے، اور سکیسر کی پہاڑیاں جھیل کی طرف اترتی ہوئی موٹر کی جھنجھناہٹ کو دہرائے جا رہی تھیں اور مریاں کی واویلا کو دہرائے جا رہی تھیں، اور کتوں کی آوازوں کو دہرائے جا رہی تھیں۔

پھر ایک دم جیسے مریاں پر وحشت سوار ہو گئی، لپک کر اس نے لڑکھڑاتے ہوئے فضلو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ فضلو سر اور گھٹنوں کے بل دھب سے گیلی زمین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

وہ ٹٹی اور کوٹھری کی پچھلی طرف پرانے کھوہ کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک پر آ گئی، سر پہ ہاتھ رکھے وہ روئے جا رہی تھی، وہ نیچے وادی کی طرف بھاگی جا رہی تھی، اور چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔

ایک موڑ پر جا کر وہ تھم گئی، شیرو کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں "اس دوسرے حرامزادے کو ایک آخری بار دیکھ لوں" اس نے فیصلہ کیا اور واپس رئیس خانے کی طرف بھاگی۔

فضلو اسی طرح دروازے کے پاس سر اور گھٹنوں کے بل بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔ اور شیرو کا گلا چیختے چیختے بیٹھ گیا تھا، مریاں نے دروازہ کھول کر شیرو کے پاس جانا چاہا مگر پھر جیسے بجلی کی سی تیزی سے فضلو کے پاس آ گئی۔ ایک

لمحہ بُت کی طرح جمی رہی۔ پھر جھک کر اسے بٹھانا چاہا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا کیچڑ اور لہو نے اس کے چہرے کو نہایت خوفناک بنا دیا تھا۔ اور اوپر بدلیوں میں دوڑتے ہوئے چاند نے اس گھناؤنے پن کو چمکا دیا تھا۔

"میرا فضلو" اس نے فریاد کی۔

پھر اندر کوٹھری میں جا کر چراغ اٹھایا۔ شیرو بھاگ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، وہ چراغ اُٹھائے باہر آئی تو شیرو بھی اس کا پلو تھامے باہر چلا آیا، وُہ چراغ کو فضلو کے چہرے کے قریب لا کر اور اس کے پپوٹے اٹھا کر اس کی پتلیوں میں زندگی کے آثار ڈھونڈنے لگی

"میرا فضلو! میرا مالک، میرا سائیں!" اس کے بین چار طرف گونج اٹھے اور پھر ایکا ایکی تھم گئے، فضلو کی آنکھیں ذرا سی کھلیں، اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا۔ مٹھی کھلی اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے سو روپے کے نوٹ کو چراغ کی لو سے جلاتے ہوئے ہولے ہولے کہا "میں تمہیں نہیں جانے دوں گا، تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔"

شیرو اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں" فضلو نے رکتے رکتے کہا۔

نوٹ کی راکھ سکڑ کر گری اور نئیس خانے کی طرف اڑ گئی۔

"مریاں،" فضلو نے التجا کی۔

"تم مر گے تو نہیں؟" مریاں نے سسکیوں میں پوچھا۔

"نہیں" فضلو نے بڑے یقین سے کہا۔

"حرامزادے۔" وہ بلک بلک کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔
"سور کی بچی!" وہ اس کے بالوں کو خون آلود ہونٹوں سے چومنے لگا۔
موٹر نیچے جھیل کے کنارے کنارے تیرتی جا رہی تھی۔

آتشِ گُل

اس قدر چونکا دینے والا زرد رنگ میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے سے ذرے چھٹ کر انگلیوں میں چلے آئیں گے۔ اسے دیکھتے ہی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کو مس کرنا چاہیئے، سہلانا چاہیئے، نچوڑ لینا چاہیئے۔ نہ جانے یہ اس کی قطعی غیر قدرتی اور آسیبی زردی کا اثر تھا یا اس کی سر راہ لٹ کر رہ جانے والی جوانی کا تقاضا۔ لیکن مجھے صرف اتنا اعتراف کرنا ہے کہ اس کی رنگت کی زردی میں بجلی کی لہروں کا سا اثر تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اس کی طرف کھچا چلا جا رہا ہوں اور پھر ایک دم ذہن کو سنسنا دینے والا جھٹکا محسوس ہوتا تھا اور میں دبی زبان سے صرف اتنا ہی کہہ پاتا تھا "اور کیا لکھنا ہے؟"

وہ صرف مجھی سے خط لکھواتی تھی، میں ان دنوں بیمار اور بے روزگار ہو کر گاؤں چلا گیا تھا۔ وہاں ڈی، ایچ لارنس اور آسکر وائیلڈ کی کتابوں سے جی بہلاتا تھا اور جب ان کی گدگداتی ہوئی لذتیت میرے اعصاب کو جھنجھا دیتی تھی تو اقبال کے

لیکچر میری دستگیری کے لئے تیار رہتے تھے۔ اقبال مجھے فلسفے کی شاہراہوں پر سے ماضی میں لے جاتا تھا، اور ماضی مجھے خلفائے عباسیہ کے درباروں میں گھسیٹ لے جاتا تھا۔ اور پھر ایک دم نفیریں بجتی تھیں اور ناچنے والیوں کا ایک انبوہ کہیں سے امڈ پڑتا تھا۔ پھر اچانک مجھے ان ناچنے والیوں میں آسکر وائیلڈ کی سلومی دکھائی دے جاتی تھی اور عنبر و لوبان کی لہریں میرے حواس میں گھس کر سرگوشیاں کرنے لگتی تھیں "تم مجھے بوسہ نہیں لیتے دیتے تھے نا؟ ——— نہیں لینے دیتے تھے نا؟" ——— اور پھر میں سلومی پڑھنے لگتا تھا۔

میں سلومی ہی کو پڑھ رہا تھا جب وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی، اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے سلومی کتاب کے صفحوں میں سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہے، ایک لمحے کے لئے میں اسے گھورتا رہ گیا۔ اور وہ سمجھی کہ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں، شاید اسی لئے وہ بولی "میں گلابو ہوں ——— گلابو دھوبن!"

میں گلابو دھوبن کو جانتا تھا، لیکن گلابو دھوبن کے چہرے کی زردی میرے لئے اجنبی تھی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ لیکن عام چیزوں کے ہجوم میں بھی ایک نہ ایک چیز میں کوئی خصوصیت ایسی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم اسے چن لیتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ چیز ان سب چیزوں سے اچھی ہے۔ کیوں اچھی ہے؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ اور اسی لئے میرے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ جب گلابو ایک عام سی لڑکی تھی تو ایک زمانے میں وہ گاؤں کے سب نوجوانوں کی گفتگو کا موضوع کیوں بن گئی تھی، میں نے

ایک بار اس کے ہونے والے منگیتر رمضو سے یہی سوال پوچھا تھا تو وہ دم بخود سا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک آگئی تھی جیسے اس کی پتلیوں کے ادھر اچانک چراغ جل اٹھے ہیں اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا "جس دن مجھے یہ پتہ چل گیا، اس دن میرے بنسے گلابو مر جائے گی۔ مزا تو اسی میں ہے کہ کچھ خبر تک نہ ہو اور لٹ جاؤ"

اور اب یہی گلابو سرسوں کے پھولوں کا سا زرد چہرہ لئے میرے سامنے کھڑی تھی اور مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی، اور باہر صحن میں سے امّی کی آواز آ رہی تھی۔ "اسے جلدی سے خط لکھ دو بیٹا، بے چاری بڑی ستم رسیدہ ہے، میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے، لکھ دو بیٹا جلدی سے"۔

"خط لکھوانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں، درخواست لکھوانی ہے، کمانڈنگ افسر کے نام، پنشن کا جھگڑا ہے" ——— وہ پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی، اور پھر بغل کے اندر سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا "اس چٹھی کا جواب لکھنا ہے"۔

اس چٹھی کو پڑھ کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ رمضو مر چکا ہے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں بھرتی ہو کر کلکتے گیا تھا اور پھر برما میں پسپا ہوتے وقت مارا گیا تھا، بعد میں مجھے اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ جب برما کے جنگلوں میں سے گزرتے ہوئے ایک دم گنجان جھنڈوں میں سے ان پر گولیوں کی بوچھار ہونے لگی تو وہ سب دھب سے زمین پر لیٹ گئے۔ اور جب وہ درختوں کے تنوں کی آڑ لینے کے لئے رینگ رینگ کر بڑھنے لگے تو رمضو ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اسی طرح منہ کے بل

زمین سے چمٹا رہ گیا - اور جب اس کے ساتھی نے رمضو کے پاس جا کر اسے پکارا - اور اس کا سر اٹھایا تو وہ مر چکا تھا، اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور لہو کے چند قطرے اس کی ناک سے پھوٹ کر اس کی مونچھوں کی جڑوں میں جمع ہو رہے تھے، ـــــ "پھر؟" میں نے رمضو کے ساتھی سے پوچھا۔ اور اس نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال قطعی احمقانہ ہے۔

"پھر کیا! پھر ہم وہاں سے چلے آئے"۔

ٹھیک ہے، میرا سوال واقعی احمقانہ تھا، اس کے بعد سب وہاں سے چلے آتے ہیں۔ سرکاری رجسٹروں میں دو لفظوں کا اندراج ہوتا ہے، پنشن کے جھگڑے چلتے ہیں، مرحوم سپاہی کی قیمت چکائی جاتی ہے، اس کے والدین اور اس کی بیوی بچوں کے درمیان دس یا پندرہ یا بیس روپوں کی ننھی سی دیوار ایک فصیل بن کر ابھر آتی ہے اور ان فصیلوں کے رخنوں میں سے کوئی پیار سے نہیں جھانکتا۔ یہاں سے ایک دوسرے کی طرف صرف گالیاں منتقل کی جاتی رہتی ہیں۔ اور وہاں باپ کے ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے اور بیواؤں کے چہروں پر سرسوں پھولتی ہے۔

میں نے زرد رو گلابو کی طرف دیکھا - میں افسوس کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا جب اس نے بکل میں سے ایک اور صاف ستھرا کاغذ نکالا اور بولی "درخواست کے لئے یہ میں ایک کاغذ بھی لیتی آئی ہوں، انگریزی میں اتنا لکھ دیجئے کہ حضور! یہ میں مانتی ہوں کہ رمضان کی پنشن پر اس کے باپ کا حق ہے اس لئے کہ وہ بوڑھا ہے پر

اس کی بیوی کا بھی تو حق ہے، اس لئے کہ وہ جوان ہے؛ اور اس کے "تین بچے ہیں اور غلہ مہنگا ہے اور کپڑا ملتا ہی نہیں اور جب عورت کے پاس نہ شوہر باقی رہے نہ روپیہ تو ——— تو ——— بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے، آپ ذرا کوئی اچھی سی بات بنا کر ڈھنگ سے لکھیں گے، میری نو کو اس کی عادت ہو گئی ہے!"

بات بنی بنائی تھی۔ میں نے گلابو کی پنجابی کو انگریزی میں منتقل کر دیا۔ وہ درخواست لے کر چلی گئی اور پھر سلومی نے کتاب کے صفحوں میں اٹکے کہا "اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں دو گے؟ ——— نہیں دو گے؟"

اسی روز شام سے پہلے میں کھیتوں میں ٹہلنے نکل گیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور شام سے پہلے ڈھلتی دھوپ اور لمبے لمبے سایوں کے اتصال سے ایک بڑی لطیف سی خنکی ہوا میں رچ جاتی تھی۔ اعصابی بیماری کے باوجود مجھ پر اس لذیذ خنکی کا یہ اثر ہوتا تھا کہ کبھی میں گنگناتا ہوا دور نکل جاتا، کبھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر چھاتی پھیلا لیتا۔ لمبی لمبی سانسیں لیتا اور مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے رقص سے کچھ دیر پہلے رقاص کو محسوس ہوتی ہو گی، لیکن اس شام کو مجھے نہ گنگنانے کا خیال آیا نہ لطیف خنکی کو پھیپھڑوں میں جمع کرنے کا۔ میں کچھ سوچتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ "کچھ" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ بعد میں جب میں ان سوچوں سے چونکا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک رو میں نہیں سوچ رہا تھا۔ ابتدا گلابو کے چہرے سے ہوئی تھی، پھر مجھے لاہور میں بسنت کا تہوار یاد آ گیا تھا۔ جب میرے ایک ہندو دوست نے مجھے انڈوں کی زردی کا حلوہ کھلایا تھا۔ اس کے بعد جانے مجھے چین کیوں یاد آ گیا۔ بہرحال میں نے چین کے بارے میں بھی بہت کچھ

سوچا تھا۔ قدیم چینی شہنشاہ اور پھر قبلائی خان کے دربار کی شان و شوکت اور اس کے مردہ جسم پر سجے ہوئے شاہی گھوڑوں کا ناچ —— قبلائی خان کی روندی ہوئی لاش نے مجھے اپنا ایک دوست یاد دلایا جس نے ہڑتال اور سنکھیا پھانک کر خودکشی کر لی تھی اور اس کی محبوبہ جو تنور میں روٹیاں پکا کر گزر کرتی تھی تیسرے ہی روز ایک تنور والے کے ہاتھ اپنی مرضی سے ایک سو روپے میں بک گئی تھی اور اس نے کہا تھا "پگلے نے خواہ مخواہ مجھ بے چاری کو بدنام کر دیا۔ ورنہ میری ایسی صورت والے تو ایک ہزار میں بھی سستے ہیں!" —— روپوں کی جھنکار سے مجھے رمضو کی پنشن یاد آگئی اور پھر گلابو اور —— پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پر اونگھ رہی تھی، سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحت مند زردی میں چمک سی آگئی تھی اور آسمان کے وسط میں اڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی کو ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دیا تھا۔

اور یوں جب میں اپنی بے ربط اور غیر مسلسل سوچوں کا جائزہ لے رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ذہن میں زرد رنگ تیر رہا تھا۔ تو اتفاق سے وہاں پگڈنڈی پر حافظ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی، یہ گلابو کا بوڑھا خسر تھا، اندھا تھا اس لئے لوگ اسے حافظ کہنے لگے تھے، آنکھوں کا کام لاٹھی سے لیتا تھا۔ اس کی لاٹھی سانپ کے پھن کی طرح اٹھتی تھی اور پھر جھک کر پگڈنڈی کا صاف ستھرا سینہ ٹٹول لیتی تھی اور حافظ ایک دو قدم آگے بڑھا لیتا تھا، میں سیدھا پگڈنڈی پر آ رہا تھا۔ اس لئے اب کے حافظ کی لاٹھی کا پھن اٹھا تو جھکا نہیں،

بلکہ مجھے سونگھ کر خبردار ہو گیا۔ اور حافظ رک گیا "کون ہے بھائی؟" اس نے پوچھا۔ اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو ایک دم اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "مجھ سے تمہیں کیا دشمنی تھی بیٹا؟ میں تو تمہارے سارے خاندان کا پرانا خادم ہوں۔ میں تو برسوں تمہارے بزرگوں کی رکاب تھام کر کوسوں پیدل چلا ہوں اور اپنے مقسوم پہ نازنہ کیا ہے۔ اور اب بیٹا تم میرے رمضو کی پنشن اس حرامزادی کے نام لگوانا چاہتے ہو جس نے تین بچے جنے ہیں۔ نو دس نکلوائے ہیں، اور جس نے مسجد کا تیل چرا کر اپنے یاروں کے لئے پکوڑے تلے ہیں اور جس روز میرے رمضو کی موت کا تار آیا ہے تو اسی روز اس نے کاجل لگایا ہے اور بین کرتے ہوئے سارے گاؤں کو بتایا ہے "میں سہاگن ہوں۔ میں سدا سہاگن ہوں" ــــــ بوڑھے حافظ نے یہ الفاظ عورتوں کی طرح بین کرنے کے انداز میں کہے اور پھر اس کے چہرے میں تناؤ سا پیدا ہو گیا "نہیں بیٹا تم اس کے لئے چٹھیاں نہ لکھا کرو، یہ پندرہ روپے رمضو کے ماں باپ کیلئے رہنے دو، رمضو کی گھروالی تو خود بڑی کمائو ہے"۔

میں نے بوڑھے سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ لیکن اس کے بعد روزانہ بار بار میرا جی چاہا کہ حافظ اور گلابو کے ہاں جا کر سب کو جمع کروں اور رمضو کی پنشن کے سلسلے میں ان کی آپس میں صلح کرا دوں، یوں ہی خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ جیسے پندرہ روپے کے پیچھے یہ کشمکش خود میرے گھر میں ہو رہی ہے، اور ایک دن جب میں نے امّی سے بھی اس کا ذکر کر دیا تو وہ باغ باغ ہو گئیں "جاؤ بیٹا۔ ابھی جاؤ" دس در دنیا ستّر در آخرت جا ایک

بھلا کرے گا اس کا سدا بھلا ہو گا۔ ان سے کہو آدھی آدھی پنشن بانٹ لیا کریں۔ ——— میرے سامنے اچانک رمضو کی لاش ابھری جھٹک سے ایک تلوار گری اور رمضو دو ہو کے رہ گیا اور پھر جیسے ایک حصے کو اس کے ماں باپ گھسیٹے لئے جا رہے تھے تو دوسرے حصے سے اس کی بیوی اور بچے چمٹتے چلے گئے تھے اور اب میرے سامنے جمے ہوئے خون کے ایک دائرے کے سوا اور کچھ نہ تھا ——— میں نے فوراً اس تصویر کو جھٹک دیا۔ اعصابی بیماریوں پر قابو پانے کے لئے میں کسی تصور کسی خیال، کسی سوچ کو سختی سے جھٹک ڈالنے کا عادی ہو رہا تھا۔ مگر اس کے بعد ایک دم جیسے میں چکرا کر رہ گیا۔ میرے سامنے گلابو کھڑی تھی۔

گلابو سے کچھ کہے بغیر یکایک امی نے بڑے غصے اور رقت سے بولنا شروع کر دیا "حافظ بکواس کرتا ہے۔ اس کی ساری عمر بکواس کرتے گزری ہے، اس نے کچہری میں جا کر قرآن شریف کی قسمیں کھائی ہیں اور جھوٹی گواہیاں دی ہیں، اور اب وہ گلابو کے خلاف بکتا ہے؟ بکنے دو، چاند کا تھو کا منہ پر آتا ہے، تم افسر کو ایک اور چٹھی لکھ دو۔ پورا زور لگا دو اپنے علم کا، اور کہو کہ اگر رمضو کی پنشن کا کوئی حقدار ہے تو یہ گلابو ہے، اس کی بیوی، آ بیٹی! بیٹھ جاؤ، خط لکھوانا ہے؟"

اور گلابو کے چہرے کی سرسوں کو جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی نے چمکا دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ حافظ کی بکواس سے بددل ہو کر منہ لٹکا لیتی، مسکرانے لگی اور بولی "تو میرے آنے سے پہلے اس گھر میں میرا ہی ذکر ہو رہا تھا! ——— جیسے ہم ماں بیٹے نے اس سے پہلے اس کا ذکر کر کے اسے ایک سنہری سند دے ڈالی تھی۔ امی نے تو خیر حسبِ عادت گلابو سے اظہارِ محبت شروع کر دیا۔

اس کی بے بسی اور بے کسی پر وہ قربان ہو ہو گئیں اور حافظ کی بکواس کی ساری تفصیلات
گن گن کر ان کو رد کرتی رہیں۔ لیکن میں وہاں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور
ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ گلابو میرے کمرے میں آ گئی۔ پلنگ کے پائے
سے لگ کر بیٹھ گئی اور ٹکل میں سے ایک لفافہ نکال کر بولی "یہ جواب آیا ہے۔
پڑھ دیجئے"۔

جواب یہ آیا تھا کہ چونکہ رمضو نے اپنی زندگی ہی میں تنخواہ اور پنشن کا حقدار
اپنے باپ کو قرار دیا تھا اور سولجر بورڈ نے بھی اسی کے نام کی سفارش کی ہے۔
اس لئے پنشن اس کے باپ ہی کے نام جائے گی، گلابو اگر چاہے تو اپیل
کر سکتی ہے۔

"تم چاہو تو اپیل کر سکتی ہو" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

"اپیل بھی کر لوں گی۔ میرا کیا لگتا ہے"، گلابو نے بڑے اطمینان سے جواب
دیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگی "میرے آنے سے پہلے آپ میرا ہی ذکر کر رہے تھے؟"

"ہاں!" میں نے تعجب سے کہا۔ اور سوچا کہ کیا اس کا ذکر اس کی اپیل پر توجہ
رکھتا ہے "حافظ تمہارے خلاف بہت بک رہا تھا"

میرے یہ الفاظ اس کی مسکراہٹ کو بجھانے کے لئے کافی تھے، مگر وہاں تو
جیسے جلتی پر تیل پڑ گیا۔ مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی اور وہ بولی "پندرہ؟ روپیے
بڈھے کے دماغ میں اس زور سے بجے ہیں کہ میں تو کہتی ہوں کہ اگر اب اسے
جیتا جاگتا رمضو مل جائے تو پنشن بند ہو جانے کے ڈر سے وہ اسے اپنے ہاتھوں
مار ڈالے گا۔ رہ گئے میرے بچے، سو بچے تو گلیوں میں رلتے رلتے بھی پل جاتے ہیں

اور میرے بچوں کے سر پہ تو ایک چھت بھی ہے" ——— اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی اور پھر ایک صاف ستھرا کاغذ نکال کر بولی "اپیل لکھ ڈالیے اور آخر میں کہیے کہ خدا آپ کا بھی بھلا کرے اور میرا بھی، ملک پنجاب میں لوگ بھوک سے ذرا کم ہی مرتے ہیں، اور میں مر جاؤں گی، پر اپنے بچوں کو بھوکوں نہیں مرنے دوں گی۔ آپ نے تو پنشن بڈھے کے نام لگا کر اپنے سپاہی کے بچوں کو مارنا چاہا، پر میں بھی تو انہیں مرنے دوں ——— اور میں انہیں نہیں مرنے دوں گی" ——— رک کر اس نے گلا صاف کیا اور پھر ذرا بدلی ہوئی آواز میں بولی "جی چاہتا ہے ایک موٹی سی گالی بھی لکھوا دوں" ——— اور پھر مسکرا کر کہنے لگی "انگریزی میں بھی گالیاں ہوتی ہیں جی؟"

میں بھی مسکرا دیا۔ اور پلنگ کے پائے کا سہارا چھوڑ کر اس نے اپنا ایک بازو پلنگ پر پھیلا دیا اور اس پہ اپنی ٹھوڑی رکھ کر مسکرائے چلی گئی۔ ایک معقول اپیل لکھ کر میں نے اس کے حوالے کی۔ اس نے کاغذ کو تہ کر کے اسے بغل میں رکھا اور پھر اسی طرح بازو پہ ٹھوڑی رکھ کر بولی "سارا گاؤں کہتا ہے آپ کے قلم میں بڑی طاقت ہے، سوچتی ہوں اگر آج رمضو زندہ ہوتا تو آپ سے ایک خط اس کے نام لکھواتی"۔

میں اداس ہو گیا اور وہ مسکراتی رہی۔ پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک بیٹھا لارنس کی ایک کہانی پڑھتا رہا۔ مگر جب چند صفحے پڑھ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس دوران میں پڑھا کچھ بھی نہیں بلکہ سوچا ہے اور وہ بھی گلابو کے بارے میں۔ تو میں سلومی کا ڈرامہ

پڑھنے لگا۔ اور جب سلوچی اپنے سوتیلے باپ اور سگی ماں کے سامنے ناچنے لگی تو مطالعہ ختم ہو گیا اور ناچ شروع ہو گیا۔ اور جب میرے اعصاب تن کر تقریباً بج اٹھے تو امی اندر آئیں، بولیں "پڑھ رہے ہو؟" میں نے کہا "امی! سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے پاس ہر مہینے پندرہ روپے ہوتے تو میں انہیں حافظ کے سامنے بجا کر گلا لبو کو دے آتا۔ بڑا غصہ آ رہا ہے۔"

"پندرہ روپے ہوتے تو میں اپنے بچے کا نیا لحاف نہ بنوا لیتی؟" وہ کمبل پر سے چنگیر اتارتے ہوئے بولیں "ایسی باتیں نہیں سوچتے بیٹا۔ تمہارے پاس علم کی دولت ہے وہ جتنی چاہے بانٹو اور روپے بانٹنے کی نہ سوچا کرو۔ تمہی بتاؤ آج کتنے دنوں سے میں نے تمہاری چائے کے ساتھ پراٹھا نہیں پکایا۔ بتاؤ!"

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری شدید اعصابی بیماری پھر سے عود کر آئی ہے، اور ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ بیماری ذہنی ہوتی ہے۔ آج وہ ڈاکٹر میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے کہتا "لاؤ میری دونوں جیبیں روپوں سے ٹھونس دو، پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ یہ بیماری ذہنی ہے یا اقتصادی؟" — میں فوراً اٹھ کر باہر کھیتوں میں چلا گیا اور "کچھ" سوچتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔

"کچھ" میں ابہام ہے اور میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن جب سوچوں میں کوئی تسلسل نہ ہو، تو اور کہا ہی کیا جائے۔ اتنا یاد ہے کہ میں دو پلے کے بارے میں اور پھر جنوبی افریقہ میں سونے کی کانوں کے متعلق اور اس کے بعد شاید ڈوبتے چاند کے بارے میں اور پھر سرسوں کے پھولوں کے متعلق سوچتا رہا۔ اس روز اختلاج قلب بھی بڑھ گیا اور خون کا دباؤ اتنا شدید ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا

کنپٹیوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہے، پھر جب میں واپس آیا تو یہ واپسی بھی میری سوچوں ہی کا ایک حصّہ تھی۔ اور گلابو کے گھر میں داخل ہُوا تو یہ بھی محض ایک سوچ ہی تھی۔ بعض سوچیں اس نوعیت کی بھی تو ہوتی ہیں کہ سوچ میں جسم بھی ذہن کا ساتھ دیتا ہے، جسم بھی سوچتا ہے۔ اور جب جسم سوچتا ہے تو اس سوچ میں حرکت ہوتی ہے، یہ سوچ کا عمل ہوتا ہے، اور یہی سوچ مجھے گلابو کے گھر میں لے آئی لیکن جب آنگن کے غیر مانوس ماحول اور بچوں کی چیخ پکار نے میرے ذہن اور جسم کو اس کیفیت سے چونکایا تو ٹھٹھک کر رہ جانے کی بجائے میں تیورا کر پیچھے ہٹا۔ جیسے کسی نے میری ٹھوڑی کے نیچے زنّاٹے کا مکّا مارا ہے! اور میں بھاگ کھڑا ہُوا۔ یہ میں نے محاورۃً نہیں استعمال کیا، میں وہاں سے سچ مچ بھاگ آیا۔ مگر بھاگ کر گھر نہیں گیا۔ کھیتوں میں نکل گیا! اس وقت سرسوں کے پھول اندھیرے میں ڈوب چکے تھے، البتہ اِدھر اُدھر چند جگنو یوں اڑتے پھر رہے تھے جیسے سرسوں کے پھولوں کو پر لگ گئے ہیں۔

گھر واپس آکر میں نے اکٹھی چار خواب آور گولیاں کھائیں اور رات بھر سلومی کے ہاتھوں پہ سجے ہوئے سنہری طشت میں سلومی کے محبوب کا کٹا ہُوا سر دیکھتا رہا جس کے نیم وا مردہ ہونٹوں پہ بار بار سلومی کے جذبات اور وحشت سے الجھے ہوئے ہونٹ پیوست ہو جاتے تھے اور سلومی کہتی تھی "اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں لینے دیتے تھے نا؟ —— نہیں لینے دیتے تھے؟"

شاید میں نیند میں سلومی کے الفاظ بھی بڑبڑاتا رہا، اس لئے کہ جب دوسرے دن کافی دن چڑھے امی نے مجھے جگایا تو ان کی چتون پہ کچھ ایسے ہی بل

تھے جیسے اس روز ابھرے تھے جب میرا اوولٹین ملا دودھ پی جانے پر میں نے
تلّی کو ماں کی گالی دے دی تھی۔

نیم خوابی کی حالت میں چائے پی کر میں پھر سو گیا اور دن ڈھلے اٹھا۔ میرا سارا
بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اور امّی جو باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ بولیں " نہ خدا کا نام نہ رسول
کا، بس پڑا پلنگ توڑ رہا ہے، شام کو سویا ہے تو اب دوسری شام ہونے کو آئی
ہے کہ آنکھ کھل سکی ہے، یہ تم بیمار ہو کہ کوئی نشہ پیتے ہو؟ ——" وہ اسی طرح
بولے چلی گئیں اور میں حالات کو سنبھالنے کے لئے لپک کر ان کے پاس پہنچا،
ان سے لپٹ گیا، ان کے ہاتھوں کو چوما، ان کے پاؤں دابے اور بڑی لجاجت
سے کہا " نہیں امّی، سچ پھر ایسا نہیں ہوگا۔ رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس
لئے نیند لانے والی گولیاں کھائیں۔ یہ سب انہیں کا کیا دھرا ہے، اب تک
آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں "

" اور یہ تم رات بھر کیا بکتے رہے؟" امی کی چتون کے بل اور گہرے ہو گئے۔

" خواب دیکھتا رہا" میں نے گھبرا کر کہا " وہ میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں،
اس میں ایک شہزادی ہے جو ——"

" بس بس بخشو مجھے" وہ بولیں " سونے میں تھوڑے بکے ہو کہ اب پوری کہانی
سنانے چلے ہو مجھے؟ —— اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ اولاد کو علم پڑھاؤ ——
اور جو پڑھاؤ سو سنو نئے جاگتے شہزادیاں دیکھی جارہی ہیں اور ان سے ——
ان سے بکواس کی جارہی ہے "

بڑی مشکل سے امّی کو منا کر میں یہ تہیہ کر کے اٹھا کہ آسکر وائیلڈ کی کتاب

کو تلف کر دوں گا۔ ادب دفن اعصابی امراض میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں، اور خاص طور سے آسکر وائیلڈ تو سراسر اعصاب ہے۔ میں اٹھا ہی تھا کہ حویلی کے دروازے میں سے گلابو داخل ہوئی اور اچانک میں نے سوچا کہ اس کتابی سلومی کو تلف کر دوں یا اس جیتی جاگتی سلومی کا گلا گھونٹ دوں جو میرے پاس چار منٹ بیٹھی ہے تو مجھے چار خواب آور گولیوں کا محتاج کر جاتی ہے۔

امی کے پاس بیٹھ کر اس نے چادر کا پلو کھولا اور مسکرا کر بولی "ابھی ابھی شیرا یہ ننھے ننھے بیر لایا ہے، میں نے کہا موسم کا پھل ہے شاید یہ پسند کریں"—— اس نے میری طرف دیکھا اور میں گھبرا کر بیروں کو دیکھنے لگا۔ خون کے آنسو میں نے کبھی دیکھے نہیں اس لئے بیروں کو ان سے تشبیہ نہیں دوں گا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلابو کے دامن میں ننھے ننھے بیر نہیں بلکہ وہ اپنے ہی خون کے آنسو جمع کر لائی ہے —— لیکن وہ تو مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بڑی صاف سنہری چمک تھی۔ خدا نہ کرے ایسی آنکھیں کبھی روئیں، اور وہ بھی خون کے آنسو! ایسی آنکھیں تو صرف چمکنے کے لائق ہیں۔ لیکن یہ چمک آتی کہاں سے ہے؟ خون میں بھی تو چمک ہوتی ہے! میں نے حسب عادت سر جھٹکا اور ان خیالوں کو شبنم کی طرح جھاڑ دیا۔

مٹھی بھر بیر اُٹھا کر میں بولا "بڑے خوبصورت بیر ہیں۔"

"میٹھے بھی ہیں۔" اس نے کہا۔

"اتنے پیارے بیر میٹھے نہیں تو کیا کھٹے ہوں گے" امی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، حسن کا ذائقہ بڑا لطیف ہوتا ہے" میں نے فلسفہ بگھارا لیکن

افسوس ہے کہ نہ اسے امی سمجھیں نہ گلابو۔

امی نے پوچھا "کیا کہا ؟"

گھبرا کر میں نے اپنی تھیوری کی تشریح کی "خوبصورتی کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ ہم خوبصورت چیز کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ذائقہ زبان پر محسوس ہوتا ہے۔"

"اے ہے اس میں تو کیڑا ہے!" امی نے بڑی نفرت سے ایک بیر کو دور پھینک دیا اور گلابو کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ اس کا رنگ ایک دم خوف تا حد تک زرد پڑ گیا اور وہ گنہگاروں کے سے انکسار سے بولی "میں تو سمجھی تھی کہ اس موسم میں کیڑے ہوتے ہی نہیں"

"کیڑوں کا بھی کوئی موسم ہوتا ہے!" امی نے بیروں کو گلابو ہی کے دامن سے ڈھانک دیا تھا۔ اور پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "پھینک دے انہیں، تو تو پہلے ہی بیمار ہے۔"

میں دوگونہ صدمہ سے دوچار تھا۔ ایک تو حسن کے ذائقے کی تھیوری غلط ہو گئی تھی۔ دوسرے گلابو اداس ہو گئی تھی، اور گلابو کی اداسی تھیوری کی شکست سے زیادہ اہم تھی۔ اس لئے میں نے کہا "کھاؤں گا نہیں امی، انہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ موتی ہیں بالکل"——

اور یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب گلابو میرے پاس آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میری اس بات نے اسے کافی سنبھالا دیا ہے۔ چہرے کی زردی میں سے آسیب کا عنصر غائب ہو چکا تھا۔ وہ آکر چپ چاپ میرے پاس کھڑی ہو گئی۔

اور چینی کی اس پلیٹ کو دیکھنے لگی جس میں ننھے ننھے "تازہ" بیر چمک رہے تھے۔
"ایک دن کی بہار ہے" وہ بولی "کل تک مرجھا جائیں گے"!

نہ جانے مجھے یوں کیوں محسوس ہوا جیسے گلابو کو میرے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں! کیسی باتیں؟ یہی بہار کی اور مرجھا جانے کی! کیوں نہیں کرنی چاہئیں؟ بس نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ شوق سے آئے، خط پڑھوائے، خط لکھوائے اور اپنی راہ لے، یہ آگ مانگنے آنا اور گھر کی مالکن بن بیٹھنا تو خلاف تہذیب بھی ہے اور بھونڈا بھی "کوئی خط پڑھوانا ہے؟" میں نے اسی جذبے کے ماتحت یہ سوال کیا۔

اس کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اور اس وقت اس نے مجھے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کہ اگر میں فوراً نظریں نیچی نہ کر لیتا تو میری پتلیاں پھٹ جاتیں، میں یونہی نیچے ہی دیکھ رہا تھا۔ جب وہ پلٹی اور چلی گئی اور جب وہ چلی گئی تو مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ فوراً اس کے تعاقب میں بھاگوں اور اس سے معافی مانگ لوں، اور کہوں کہ ہاں، یہ بیر تو مرجھا جائیں گے مگر مرجھا کر بھی یہ خوبصورت رہیں گے، حسن تابوت میں بند ہو کر بھی حسن ہی رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ، مگر باہر امی کا پہرہ بیٹھا تھا۔ اور اوپر آسمان پر سورج منہ پھاڑے کھڑا تھا اور گلیاں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا پھر جب باہر آیا تو امی نے پوچھا "کیا کہتی تھی گلابو؟" بڑا بے ڈھب سوال تھا جب سوال کے جواب میں کوئی جھوٹ گھڑنا پڑے تو سوال کو بے ڈھب نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ میں نے فوراً تو نہیں البتہ تھوڑا سا سر کھجا کر، ایک آدھ بار کھانس کر ایک ٹھنڈا

ساجھوٹ گھڑ ہی لیا۔ "کہتی تھی کل ایک اپیل کمانڈنگ آفیسر کے نام لکھی ہے آج ایک اور کمانڈنگ انچیف کے نام لکھ دو"

"لکھ دیتے" انھوں نے کہا۔

"موڈ ٹھیک نہیں تھا" میں نے ٹالنا چاہا۔

"کیا ٹھیک نہیں تھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی" میں نے تشریح کی۔

اور امی کو غصہ آگیا" اور کھاؤ نیند والی گولیاں ———" اور اس کے بعد انھوں نے طعن و تشنیع کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ اور میں وہاں سے چلا آیا۔ جانے آج امی کو کیا ہو گیا تھا کہ بات بے بات پہ ایک تقریر کر ڈالتی تھیں۔

حسب معمول کھیتوں میں ٹہلنے کے بعد دیا جلے میں گاؤں میں داخل ہوا تو گلیاں سنسان تھیں۔ میں گلابو کے گھر کی طرف سے ہو کر گذرا۔ آنگن میں جھانکا اندر کوٹھے میں ٹین کے بکس پر ٹین کا دیا جل رہا تھا اور گلابو اپنے تین بچوں کے ساتھ زمین پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی، کوٹھے کے دروازے تک پہنچنے میں مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی، یہی ذہنی مسافت۔ بڑی عجیب سی بات تھی نا۔ میں گلابو دھوبن سے شام کے سناٹے میں معافی مانگنے آیا تھا، اور نہیں جانتا تھا کہ معافی کیسے مانگوں گا اور کیا وہ مجھے معاف کر دے گی اور اگر وہ معاف نہ کرے گی تو میرا کیا بگڑے گا یہی نا کہ وہ مجھ سے چھٹیاں نہیں لکھوائے گی! نہ لکھوائے!۔ اور پھر یکایک مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میرا جسم کسی بوڑھے درخت کا کھوکھلا تنا بن کر رہ گیا ہے، خلا —— خلا ——— اور اسی لئے میں پلٹنے کی بجائے آگے بڑھتا گیا۔ اور اسی لئے مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی۔

"آپ!" وہ بوکھلا کر کھڑی ہوگئی، بچوں کے ہاتھ اور منہ بھی جہاں تھے وہیں رک گئے، سب سے چھوٹے بچے کا نوالہ منہ کے قریب آکر رک گیا تھا اور پتلی دال کے قطرے اس کی انگلیوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔

اگرچہ میں بول نہ سکا مگر شاید میرا سارا وجود مجسم عذر خواہی بن گیا تھا۔ گلابو نے فوراً پلنگ پر کھیس بچھایا اور بولی "اندر آجائیے نا، آئیے، میرے دل پر آپ کی بات سے ذرا سا بھی میل آیا ہو تو مرتے دم مجھے کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو، آئیے"۔

میں اندر آگیا، اور پھر جب باہر گیا تو اتنا معلوم ہے کہ اس دوران میں میرے وجود کی ساری خلا پر ہو چکی تھی۔ گلابو نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ اور وہ حیران تھی کہ میری آمد کی خوشی میں کیا کچھ کرے اور کیا نہ کرے! وہ ہانپنے لگی تھی۔ اسے ایک جگہ چین سے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھے مسلسل دعائیں دیئے جا رہی تھی اور مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اس نے رمضو کی پنشن کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا، بوڑھے حافظ کی زیادتیوں کا قصہ ایک بار بھی نہیں چھیڑا۔ بچوں تک کی پروا نہ کی۔ اور جب میں وہاں سے اٹھا تو بولی "برا نہ مانیے گا ایک بات کہنی ہے، ان بیروں میں کیڑے پڑتے نہیں ہیں۔ یہ جو آپ کی اتی نے ایک بیر میں کیڑا دیکھا تھا نا، تو یہ کیڑا بیر میں نہیں تھا، مجھ میں تھا۔ اور آج کل مجھ سے کیڑے نکالنے کی رسم گاؤں میں عام ہو رہی ہے، آپ برا نہ مانیے گا"۔

گلابو کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن جس اپنائیت سے اس نے یہ بات کی تھی وہ کچھ ایسی مبہم نہیں تھی، دروازے سے نکل کر جب میں باہر گلی میں آیا تو اچانک میرے ٹخنے سے ایک لکڑی بجی۔ یہ بوڑھے حافظ کی لاٹھی تھی "کون ہے؟"

اس نے اندھیرے میں کہا - اور جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو وہ دیر تک خاموش رہا جیسے میرا جواب سنتے ہی اندھیرے میں گھل گیا ہے، چند لمحوں کے بعد وہ کچھ بولے بغیر لاٹھی بجاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ لیکن موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور جیسے اسے یقین تھا کہ میں ابھی تک اسی جگہ کھڑا ہوں، بھرائی ہوئی آواز میں بولا "کوئی بات نہیں بیٹا، کوئی بات نہیں۔ وقت وقت اور زمانے زمانے کی بات ہے!"

"بے وقوف" میں نے جی ہی جی میں کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

صبح کو جب میں چائے پینے کے لئے اٹھا تو امی نے پوچھا "کل شام کو تم گلابو کے ہاں گئے تھے؟"

"جی ہاں" میں نے تعجب سے کہا

"وہاں نہ جایا کرو" انہوں نے ذرا سی تلخی سے کہا "بیواؤں کے ہاں نہیں جایا کرتے"

"پر آخر کیوں امی؟" میں جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"لوگ باتیں بناتے ہیں"

"کیسی باتیں؟"

"بکواس!"

یوں تو بات آگے نہ چل سکی، مگر میرے خیالوں میں چلتی رہی اور کافی دیر کے بعد میں نے امی سے جا کر پوچھا "آپ کو کس نے بتایا تھا؟"

"گلابو کی ساس نے، کیوں؟"

"کچھ نہیں۔"

بہت دنوں تک گلابو میرے پاس نہ آئی اور نہ میں اس کے پاس گیا۔ البتہ اس کے بارے میں ادھر ادھر سے باتیں سنتا رہا اور کڑھتا رہا۔ گاؤں کی وہ کون سی بیوہ ہے جس پر الزام نہیں تھوپے گئے، حوالدار انور بیگ کی بیوہ کے متعلق تو یہ تک کہہ دیا گیا تھا کہ رات کو اپنے صحن میں ننگی لیٹ جاتی ہے اور یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کرتی کہ کون آیا اور کون گیا۔ اور پھر گلابو تو رمضو دھوبی کی بیوی تھی، اور پھر وہ غریب تھی، اور اس کے تین بچے تھے۔

میں نے ایک دن امی سے ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ بولیں "الزام کس کس پہ نہیں دھرے گئے بیٹا؟ حضرت مریم کو تو، حضرت عائشہ کو تو، ہندوؤں کے رام کی بیوی سیتا کو تو ——— بکواس بھی کبھی رکے ہیں بیٹا؟ آدمی بکواس نہ کرے تو آدمی کیسے کہلائے؟ نیا نیا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دینے والا اذان نہیں پڑھتا، اس روپے کو یاد کرتا ہے جو اذان کے بدلے میں اسے ملے گا۔ اب بتاؤ اس بچے کو اللہ اور رسول کے پاک نام کی برکت ملے گی کہ روپے کا لالچ اور اس لالچ کے پیچھے بکواس کرنے کی عادت؟"

"میرے کان میں کس نے اذان دی تھی امی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ مگر امی کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی اور مجھے ہلکے سے ایک چپت مار کر بولیں "بکواس نہیں کرتے"

ایک روز منشی جی نے قصبے سے آیا ہوا ڈاک کا تھیلا کھولا تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ اس میں گلابو کے نام ایک سرکاری چٹھی بھی تھی، باقی ڈاک دیکھے بغیر میں سیدھا

گھرا گیا - اور اس یقین کے ساتھ کہ گلابو یہ خط پڑھوانے ضرور آئے گی - میں دن بھر بیٹھا سلومی پڑھتا رہا - آج کل یہ ڈرامہ صرف وقت کاٹنے کے کام آتا تھا - اس لیے اسے میں نے کئی مرتبہ پڑھ ڈالا تھا - اور آج ایک بار پھر پڑھ رہا تھا - اب نہ چاند کی زردی مجھے متاثر کرتی تھی - نہ سلومی کا حسن، نہ اس کے محبوب کی بے نیازی اور نہ مردہ ہونٹوں سے زندہ چمکتے ہوئے ابھرے ابھرے ہونٹوں کا مس - میرے تمام حواس سماعت میں بدل گئے تھے، آنکھوں تک سے سننے کا کام لے رہا تھا، قدموں کی ذرا سی چاپ مجھے چونکا دیتی تھی - مگر شام ہو گئی، اور پھر رات آ گئی مگر گلابو نہ آئی۔

گلابو دوسرے دن بھی نہ آئی -

وہ تیسرے دن بھی نہ آئی

چوتھے دن جب امی مجھے یوں بیکار گھر میں پڑے رہنے پہ جھڑک رہی تھیں . تو گلابو کا بڑا لڑکا شبیرا آیا اور میرے پاس آ کر بولا "ماں کہتی ہے میری ایک بات سن جائیے گا۔"

"کب؟" میں نے پوچھا -

"شام کو" وہ بولا "ابھی ابھی تو وہ پانی بھرنے جا رہی تھی"

"پانی بھرنے جا سکتی ہے اور یہاں آتے ہوئے اس کے پاؤں گھستے ہیں!" امی نے ڈپٹ کر کہا - "جا کے کہہ دو کہ نہیں آئے گا میرا بیٹا کام ہے تو خود آجائے"۔

لڑکا کل کی طرح مڑ گیا -

مجھے امی پر بڑا غصہ آیا۔ اور یہ غصہ ابھی بڑھ ہی رہا تھا کہ شبراتی دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے امی تھیں۔ وہ بولا "ماں کہتی ہے میں آنو جاؤں پر آپ کی بدنامی کا ڈر ہے"

امی نے میری طرف گھبرا کر دیکھا اور بچہ چپ چاپ جواب کے انتظار میں کھڑا رہا۔

"آؤں گا" میں نے کہا اور وہ کل کی طرح گھوم گیا۔

امی بھی چپ چاپ پلٹ گئیں۔

ایک لمحے کے بعد وہ آئیں تو آنسو پونچھ رہی تھیں "یہ لوگ بیچاری بیوہ عورتوں کو جینے تک نہیں دیتے۔ دے الزام پر الزام اور بدنامی پر بدنامی۔ اور وہ لڑکی دھوبن ہو کر بھی اتنی شریف ہے کہ کہتی ہے میں آؤں گی تو آپ بدنام ہو جائیں گے۔ پیسے پیسے کو بھی ترسو اور مفت کی لعنتیں بھی دھوتے پھرو۔ یہ بھی کوئی جینا ہے"۔

امی کی آنکھوں میں اچانک بہت سے آنسو آ گئے۔ انہیں پونچھ کر وہ بولیں "شام کو چلے جانا پر بیٹا چھپ کے جانا، بدنامی کا ڈر ہے!"

شام سے پہلے میں کھیتوں میں چلا گیا اور دیا جلے واپس آیا تو سیدھا گلابو کے آنگن میں جا نکلا۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ اندر کوٹھے میں ٹین کے بکس پر ہری کین لیمپ جل رہا تھا اور بچے وقت سے پہلے سو گئے تھے۔

میں نے یہ کہانی گلابو کے زرد رنگ سے شروع کی تھی مگر آج اتنے دنوں کے بعد میں نے گلابو کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ کیا گلابو کا رنگ واقعی کبھی زرد بھی تھا؟ اس وقت تو گلابو کے چہرے کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا چھو لو تو

جیسے مساموں میں سے لہو کی دھاریں پھوٹ نکلیں گی ابھی بات کیوں نہ کہہ دوں۔
چند لمحوں کے لئے تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اور جب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اسے گھور رہا ہوں تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی مسلسل مجھے گھورے جا رہی ہے لیکن نہیں وہ مجھے گھور نہیں رہی تھی، صرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس دیکھنے میں کتنی بہت سی کیفیتیں تھیں! آج نہ تو وہ مجھے دعائیں دے رہی تھی اور نہ بے چین تھی۔ بڑے سکون سے کچھ اس طرح دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی آسمانی صحیفہ پڑھ رہی ہے۔ میں اس تسلسل سے کچھ گھبرا سا گیا اور بے چین ہو کر بولا "چٹھی پڑھنی ہے؟"

وہ بیک وقت ہنس دی اور رو دی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس نے پہلی بار میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کہا "چٹھی جائے بھاڑ میں، مجھے پڑھیئے"

میں کھسیانا سا ہو کر مسکرایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بچے نئے نئے صاف ستھرے لحافوں میں سو رہے تھے، سب سے چھوٹے لڑکے کا ایک ہاتھ کھاٹ کی پٹی پر سے لٹک رہا تھا، اس ہاتھ میں مٹھائی تھی۔

اور گلابو کا رنگ گلابی تھا۔

میں جیسے بھٹک کر کسی دوسری دنیا میں چلا آیا ہوں، میں نے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

اور جیسے آپ باغ میں سیر کرتے جا رہے ہوں اور اچانک ایک پتھر تڑ سے آپ کی کنپٹی پر پڑے اور آپ درد سے زیادہ خوف کے مارے دم بخود رہ جائیں بالکل اسی طرح گلابو نے تڑ سے یہ جملہ میرے دماغ پر دے مارا۔

"مجھے آپ سے پیار ہے"—— اور میں دم بخود رہ گیا۔

"یہ سرخ رنگ —— یہ —— اس نے اپنے گالوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے رگڑ لیا —— "یہ —— یہ سرخ رنگ!" اب اس کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور چہرے کے جس حصے کو ہاتھوں نے ملا تھا ان میں سرسوں پھولی پڑ رہی تھی۔ "آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو تو ملمع سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے!"

میں خاموش رہا۔ گلابو کی چوٹ کا خوف تو دور ہو چکا تھا مگر اب شدید درد اور کرب نے میرے حواس کو سکیڑ دیا۔ اور اسی لئے میں کچھ نہ بول سکا اور وہ جیسے مجھے یقین دلانے کے لئے دوبارہ بالکل رو کر بولی "مجھے آپ سے پیار ہے"

"پھر؟" میں نے بالکل ڈاکٹروں کے سے انداز میں کہا۔

"پھر؟" وہ بول ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جیسے منجدھار میں گھر گئی ہے۔ "پھر؟ ——" اس نے یہ لفظ سرگوشی میں دہرایا۔

اور پھر ایک لمحے کی خاموشی میں اچانک میرے ذہن میں اس معمے کا حل ابھرا۔ خواہ مخواہ میرے ذہن پر سلومی کا کتابی کردار چسپاں ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے جھٹک کر میں نے بڑے ناصحانہ انداز میں کہا "دیکھو گلابو! میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ انسان واقعی ایسے حالات میں مجبور ہو جاتا ہے" وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور آنسو پونچھ ڈالے۔ میں نے کہا "تمہیں مجھ سے پیار ہے، اس لئے کہ تم بیوہ ہو اور تمہارے تین بچے ہیں اور تمہارے مرحوم شوہر کی پنشن میں سے تمہیں ایک

کوڑی تک نہیں ملتی لیکن گلابو میرے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ میں تمہارے اس
پیار کا کیا بدلہ دوں؟ میں بھی تو غریب ہوں!"

گلابو کی آنکھوں میں جو آنسو آ چکے تھے وہ تو خیر آ ہی چکے تھے اور وہ بھی پلکوں کی جڑوں میں پھیل
گئے تھے لیکن اس کے بعد اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ پھوٹا۔ اس کے
ہونٹ بری طرح کانپنے لگے اور ہونٹوں کے ساتھ ہی ٹھوڑی بھی، اور پھر اس
کے سارے جسم میں رعشہ سرایت کر گیا اور گالوں پر ہلدی کے سے پیلے
پیلے داغ ابھر آئے۔ اس کی انگلیاں مرگی کے مریضوں کی طرح اینٹھ گئیں اور اس
کے منہ سے آواز کچھ اس طرح نکلی جیسے وہ بہت گہرے کنوئیں کی تہ میں پڑی بول رہی
ہے "میں غریب نہیں ہوں، غریب ہوں آپ کے اور میرے اور میرے بچوں
کے دشمن۔ میں کیوں غریب رہوں؟ میں نے کونسا گناہ کیا تھا کہ مجھے بھوکوں مرنے
کی سزا دی گئی؟ ——— پر میں یہ سزا نہیں بھگتوں گی۔ میں نہیں مروں گی نہ اپنے بچوں
کو مرنے دوں گی۔ میں نے روپے کا انتظام کر لیا ہے۔ جب تک یہ سرخ ملمع میری
زردی کو چھپا سکتا ہے، میری پنشن بندھ گئی ہے۔ ہفتے میں ایک دو ایک دو چھوکرے
ضرور پھنسا لیتی ہوں، اور ہر چھوکرے سے دو دو روپے بھی لوں تو مہینے میں پندرہ نہیں
پندرہ بیس تو ملتے ہی رہیں گے۔ کیا آپ نے ہمارے نئے لحاف نہیں دیکھے؟
آپ نے میری لالٹین نہیں دیکھی؟ آپ نے میری یہ سوئی کی قمیض اور یہ منا بھی
نہیں دیکھا؟ آپ نے تو صرف یہ پڑھا ہے کہ مجھے پیسہ چاہیئے" ——— اس کی
آواز میں تحکم سا آ گیا "نہیں، پیسہ دینے والے اور بہت ہیں۔ مجھے آپ سے
پیار ہے۔ آپ سے مجھے پیسہ نہیں چاہیئے، بوسہ چاہیئے ——— آپ، مجھے

بوسہ دیں گے؟"

میں بھڑک کر پیچھے ہٹا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا، اور دروازے سے نکل جانے کی ٹھانی۔

لیکن وہ مجھ پر یوں جھپٹی جیسے باز شکار پر جھپٹتا ہے "تو کیا آپ مجھے پیار کے بدلے میں پیار نہیں دیں گے؟ —— نہیں دیں گے؟ —— نہیں دیں گے؟"

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا سلومی کے محبوب نے اپنے مردہ ہونٹوں پر سلومی کے تر و تازہ، جذبات کی شدت سے ابھرے ابھرے ہونٹوں کے مس کی چکرا دینے والی تلخی میری طرح محسوس کی تھی! —— لیکن یہ بالکل دوسری کہانی ہے!

مامتا

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ میں بھیج دیا جہاں چینی بستے تھے اور ایک انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس کے لئے پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ برآمد کئے جاتے ہی تھے۔ لیکن اب اُدھر یورپ میں ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا۔ اس لئے ہانگ کانگ پولیس کے لئے پنجابی جوانوں کی مانگ دگنی ہو گئی ہیں۔ کچھ ایسے گٹھے ہوئے جسم کا جوان نہیں ہوں، فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے، مگر اب کے ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے دراز قد نوجوان سپاہی کو دیکھتے ہی چینی باشندے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوانوں کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے۔ اور اسی سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ مجھے ہانگ کانگ لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں

بڑے مزے ہیں۔ امر اس ملک میں پولیس کے بڑے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے اور ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گداگر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی پٹڑیوں پر سے بھگا دو۔ اور جب ان کی گودوں میں سے ان کے ننھے بچے پاؤں سے جوتے کی طرح نکل جائیں تو ان بچوں کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر ان کی ماؤں کی طرف اچھال دو اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں آکر اس روپہلی خدمت کی سنہری سند حاصل کرلو۔ کولون اور اصلی چین کی سرحد پر باہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو۔ اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے پھر چین میں دھکا دے دو۔ سمندر کنارے کی سیرگاہوں میں گھومتی ہوئی نوجوان چینی لڑکیوں میں سے جسے چاہو چن لو اور اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی اس کی ماں کی مٹھی میں کوئی ٹھیکری تھما کر لڑکی کو اپنی بارک میں لے جاؤ۔ اور پوری بارک کو محظوظ و ممنون کرو۔ اور اگر کوئی سارجنٹ چھاپا مار بیٹھے تو لڑکی کو اس کے سپرد کر کے چین کی نیند سو جاؤ۔ غرض بڑے مزے تھے۔ لیکن جب ہمارا جہاز سنگاپور پہنچا تو ایک مدراسی جہازی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے والی ہے۔ جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور سنگاپور ہی میں انگریزی پولیس کے سپرد کر دیا۔ تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے،

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں سے چھلکتی معلوم ہوئی۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ ہونے والی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں

پیدا ہو گئی تھیں اور لوگ یوں تیورا تیورا کے چلتے تھے۔ جیسے قدم قدم پر اُن کے
سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے، ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں
کی پٹڑیوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے۔ جیسے
بم باروں کے انتظار میں ہیں۔ ان کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اچٹی ہوئی پٹڑیوں
میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا "جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں
ہو چکتا"۔ پناہ گزین عورتیں مارے خوف و ہراس کے قبل از وقت بچے جن رہی
تھیں، بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے
پھرتے تھے۔ ایک انگریز حکمران نے تو انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران
میں یہاں تک کہہ دیا تھا۔ کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض
نہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں ان کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے
ہونے چاہئیں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے جائے اسے
کولون کی سرحد پر لے جا کر اصلی چین میں دھکا دے دینا چاہیئے۔ پولیس کے لیئے
پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹڑیاں صاف رکھنے کا
کام سخت دشوار ہو رہا تھا۔ مورچے کھد رہے تھے۔ پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی تھیں۔
عمارتوں کے حسن کو زینت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
سارے کا سارا ہانگ کانگ زیرِ تعمیر ہے۔ شام کے بعد ہانگ کانگ اور
کولون پر اتو بول جاتا تھا۔ کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں
جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں۔ اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اور انہی روشنیوں
کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن لگنے

لگتی تھی۔ مگر اب تو ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی ترتیبی پریڈ سے تھک ہار کر بارک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ادھر ادھر کی مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا۔ مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بم باروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور زرد چہرے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں۔ اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب کے بشرے پر اس معصوم بچے کی سی لٹی لٹی کیفیت تھی جس کے منہ سے قبل از وقت دودھ کھینچ لیا جائے۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی۔ مگر دن کے ہنگاموں میں اس تصور سے بار بار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا۔ اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہتا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا تھا اور کہا تھا "ہانگ کانگ تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے بیٹا۔ تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمہیں خوابوں میں تو ڈھونڈ لیتی۔ پر تم تو ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ تمہارے میرے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر ادھر بھی ہونے لگی۔ اور تمہارے دشمنوں پر بھی کوئی آنچ آ گئی تو بتلاؤ میں یہاں اس اجڑے پجڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی، نہ جاؤ میرے بیٹے مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں وہاں

تمہارے کپڑے کون دھوئے گا۔ تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمہاری آنکھ
میں سے گری ہوئی پلک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟
—— اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیہ ہو گیا، تو؟ پچھلے سے
پچھلے سال کی طرح میری زبان گونگی ہو جائے، اگر تمہارے دشمنوں کے آدھے سر میں
درد اٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ۔ چلو
میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ، بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تو مریں گے۔ اور بیٹا،
اگر تم ادھر ہانگ کانگ میں ہوئے اور ادھر میں مر گئی تو میری قبر میں تمہارے حصے کی
وہ مٹھی بھر مٹی کون ڈالے گا۔ جو مولوی جی کہتے ہیں۔ ماں کی قبر کے اندھیرے میں
جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے، بتاؤ" —— لیکن میں چلا آیا
تھا؛ اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تھا تو اس کے چہرے
کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔ آنسوؤں میں
ڈوبا ہوا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا۔ اور رات کو بارک میں مجھے
اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں
سے ڈرنے لگتا تھا۔ اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا۔ "ماں تمہاری
پلکیں تو جھپکتی ہی نہیں۔ تمہاری پتلیاں تو ہلتی ہی نہیں۔ تم کسے دیکھ رہی ہو؟"
اور یہ سوال میں اس لئے پوچھتا تھا۔ کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح
افق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار
بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آ نکلے۔

پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں۔ اور پھر گردنیں نہوڑا کے نھلے ہوئے اژدہوں کی طرح لیٹ گئیں بجلی اور ٹیلیفون کے اکھڑے ہوئے کھمبے بلندی پر سے ٹہنیاں کھاتے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے پناہ گزینوں کا بھیجا چاٹتے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں ہال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک پلستر پیوست ہو گیا۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اسی کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں "ممی ممی" کراہ رہی تھیں، ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے۔ اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو مسلے جا رہی تھی۔ اور جب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو "میرا بیٹا" کہہ کر دھم سے گر پڑی، اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا۔ جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں جیسے جنگ نے میری باہوں سے

میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا اس کی انگلیوں سے کھیل رہا تھا۔ اور اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔ باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ بھی میرے سامنے نہیں ابھرتا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے، ہر حرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں تبدیلیوں کے بارے میں بند پڑا رہا میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا۔ اور جسم بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کبھی بھولے سے سر ہلایا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے۔ بعض اوقات پھیپھڑوں میں سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی۔ اور میں سینے پر گھونسا مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔ مگر جلد ہی میں اس قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں سے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی، میری قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "اسے باندھو" ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے میرے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر الٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سربلند مسکرا دیا، "مسکراتا ہے؟" ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور

پھر ایک گولی سن سے آئی اور سربلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے منٹ میں مر گیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشہ ہنستے سنا تو ہوش آیا۔ ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی۔ اور سربلند پیچھے گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے اور وارث کی موت جاپانیوں کے لئے لطیفہ بن گئی تھی۔ اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کر لی۔ حکم ملے تو مسکراؤ۔ حکم ملے تو نظریں اٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے کو تر کرنے کے لئے منہ کا لعاب نگلو اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی طرح جس انداز اور جس رخ سے کھڑے ہو، کھڑے رہو۔ اور پھر میں جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا۔ میں اس امید پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی۔ کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور میں کبھی کوئی گستاخی نہ کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ہم پھٹی ہوئی نیکروں میں کا غذ پھنسا کر ستر پوشی کرتے تھے۔ اور ٹوٹے ہوئے بٹنوں والے گریبانوں میں سے جھانکتے ہوئے سینے کو بازوؤں سے ڈھانپے رکھتے تھے اور ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے

ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیرہ دال ہیں سے ایک چھپہ لے سے جزیرے پر سو ڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے۔ اور اب وہ ہانگ کانگ تک پر چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں ان کی گوشمالی کے لئے ہانگ کانگ سے جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ بھی جانے والا تھا جس میں بندوقدار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرفہرست تھا رات کے دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی اور میری قمیص کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے کھد رہے تھے ایک دو پہر سے میں گھٹتے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے منظر تھا، جیسے کسی نے انار چھوڑ دیئے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہوئے سمندر پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہو گئی، اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں ان کے قریب آ کر غائب ہو رہی تھیں جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ ان کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔

ان کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ اور پھر سب سے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ؛ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا۔ بالکل کھلونا سا، اور جب میں سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تو تا۔ دوپہر سے ذرا پہلے بھی تلے۔ چھپی کی بے پایاں تیرتی اور ڈوبتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک تمام جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھا تھا۔ کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔ صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ تنگ آکر دستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔ مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ ابھار سکا۔ بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کرکے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑیوں میں بھاگ گیا۔ چڑیاں بہت سے ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اڑ گئیں جیسے، ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر ہی دم لیں گی۔

اب ہم نے حملہ بول دیا۔ جھونپڑوں کے قریب آکر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کر دیئے اور پھر جاپانی افسر نے کڑک کر چینی زبان میں کہا "اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آجائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آکر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

اور پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو صرف جنگل پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑیوں میں سے چھوٹے چھوٹے

چیتھڑے پہنے ہوئی بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں ان کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہروں، لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھاس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے۔ اور عورتیں زیرِ لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی پر اسرار فضا پیدا ہو گئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرا دے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انہیں گھیرے میں لے لیا، پھر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا "مرد کہاں ہیں؟"

ایک لمحے تک کچھ ایسی خاموشی رہی جیسے توپ میں گولہ بھرا جا رہا ہے۔

پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بڑھیا ایک قدم آگے آگئی اور بولی "روز کے کام پر گئے ہیں۔"

"روز کے کام پر"! لیڈر کوکا "یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لئے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟"

"جی نہیں" بڑھیا فوراً بولی "مچھلیاں پکڑنے!"

"اور بچے اور بوڑھے؟" افسر نے پوچھا "اور تمہاری لڑکیاں؟"

"آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلا ہے" بڑھیا اسی انداز میں بول رہی تھی "سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور ——"

"ادھر آؤ" لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی سب عورتیں چہروں کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ پیچ سے میرا دانت میرے ہی گوشت میں اتر گیا۔

چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ آئے تھے۔ روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر ادھر ادھر اڑ گئے جیسے گولی انہی کے ہجوم میں سے گزری ہے۔

دُور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔

ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے۔ خوب خوب اٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں، میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا، اُن کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یا جانے کس احساس سے کانپے جا رہی تھی اور ان کی دھنسی ہوئی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر کچھ سوچ رہی تھیں۔ جاپانی جھونپڑیوں سے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے، اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی، میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا

کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا زیرِ لب جاپ جاری کر دیا مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ ہا فوراً
دوسری طرف دیکھنے لگا اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں ان سب سے بے پرواہ ہو گیا
ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں ہی سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت پھر زمین پہ بیٹھ
گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔ مرنے والی بڑھیا
کے پاس آ کر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے
لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آ کر کھڑی
ہو گئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا
مگر میری آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سا
آگے آ کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی، میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی
پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو اس کی جھریوں میں ندیوں کی طرح
بہہ کر پھیل گئے سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا
کر میری پسلیوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ میں نے دوسری
عورتوں کی طرف دیکھا ان سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں بڑھیا کی لاش
کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔
میں نے جھک کر اس کا سر اٹھایا اور اس کے گرد وہ کپڑا لپیٹ دیا ایک جاپانی
سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ لاش کا منہ
ڈھانپنے والی عورت کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے
چہرے چھپا لیے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے

لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا۔ مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دہانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور پھر سب جاپانی واپس آ گئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا "معلوم ہوتا ہے ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کر رہا ہے اور انہی میں سے کسی نے تمہیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں وہ عمر لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جانے کے نہیں، ہم آج سارا دن ان کا انتظار کریں گے اور جب وہ آئیں گے تو تمہارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور بابوں کو تمہارے ہی سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے، اور پھر تمہیں سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔" وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور آخر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے جھولوں میں سے شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں، بادل گھر آئے تھے۔ جن کی وجہ سے سورج غائب تھا اور اتنی دیر بعد بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا، تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی۔ میں گریباں کے دونوں حصوں کو پکڑ کر ملاتا تو میرا ہاتھ سن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا۔ بڑھیا کی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ

ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیرِ لب جاپ جاری تھی۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی کھنڈ رہی تھی اور وہ منہ کھولے مجھے گھورے جا رہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر چلنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اس لئے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لئے کھانا تیار کریں گی اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

عورتیں اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں بادل گرجنے لگا، ہوائیں جیسے جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھروندے کے اس گوشے کو یاد کر رہا تھا۔ جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کئے رکھتا تھا۔ اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی "سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا۔ ہوائیں جو نمونیہ ہوتا ہے وہ سینے ہی کی راہ پسلیوں میں اترتا ہے" ——— آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے ابھرا جھریوں میں پھیلے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اٹھتے تھے جھلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آ رہا تھا ———

قریب آ رہا تھا،

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا، آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ

رہی تھی، اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ بار بار پلٹ پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی۔ جو دور ابھی تک ناچ اور گا رہے تھے۔ اور ہوا میں فائر کر رہے تھے۔

اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی، بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ اور چہرے کی جھلی کانپ رہی تھی اور پتلیوں کو آنسوؤں نے چھپا رکھا تھا، وہ میرے قریب آکر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی "قیدی ہو؟"

میں زبان سے کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا،

وہ بولی "میرا بیٹا جلدی میں تھا، میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی، اس کی قمیص میں بھی تمہاری قمیص کی طرح ایک بھی بٹن نہ تھا۔"

میں چونکا

وہ بولتی چلی گئی "تمہاری ماں ہے نا؟"

میں اب کے بھی کچھ نہ بولا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا۔ اور میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی،

اور میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چین کی یہ پہاڑی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے۔ اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گر پڑا ہوں!

الحمد للّٰہ

شادی سے پہلے مولوی اُبّل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہ بند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پہ بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی ہاتھ میں عصا جس پہ جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی اُبّل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی اُبّل ماہیے کی کلی الاپ دیتا

تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کیے ہوئے ڈیڑھ دو سو روپوں کی پوٹلی چھین سے آ گرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا "مجھے دعائیں نہ دو اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں اُسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو۔ مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، بے فکری مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہیئے"۔

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ مولوی اُبل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظامِ تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی اُبل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشنما لنگی نہالی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چولے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بنتے وقت جلاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے مثلاً کالا رہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ اتر گیا

کے بندوں جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی اُبل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ نارٹر نورڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی نارٹر نورڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی اُبل نے اپنی پہلوٹی کی بیٹی مہر النسائکے لیے جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدۃ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا اور جب مولوی اُبل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے قیمتیں یوں ایک دم زمین سے اوپر گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے ایک چونی کما رہا ہوں، چلئے آپ چونی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی اُبل خدا سے اپنی عمدہ کے لئے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا۔ اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر۔ مولوی اُبل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایکدم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دوکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہ، کو حاضر و ناظر مان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریاتِ زندگی کی

قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی ابل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہرالنساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا ادھر مولوی ابل کی یہ حالت ہوگئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوئی، مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورۃ الرحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا۔ چودھری فتح داد کرسی نشین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چودھری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہوگئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھاتا کہ ایک سورت کو دوبار کیسے پڑھ لیا جاتا ہے"۔ لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہوگیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذراسی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفس نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہوگا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور رکھانا

نائن نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہوگا۔"

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے۔ اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔ مولوی ابل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آجاتی تھیں۔ ادھر زیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے "وظیفوں" پہ ذرا ذرا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النساء کو وہ چنگیریں ان کے لئے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی بچتے انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں ابال کر میٹھے ٹکڑے تیار کئے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی تو چاہیئے۔ چودھری فتح محمد ہر فصل پر مولوی ابل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب بھی یہ پوشاک گھر میں آئی۔ ایکا ایکی درزی کی دوکان سج گئی۔ زیب النساء، مہر النساء اور زبیدہ اور شمس کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہ بند کا نیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں نخنوں کے بہت سے چولے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لئے مولوی ابل کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آ نکلتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے

تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا —— زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی سانولی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے اب ذرا سے جھٹکے سے پہنچے پر آجاتے تھے اور اس کی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبل سرد راکھ بن چکا تھا۔ اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی ابل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی ابل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں بج اٹھتی تھیں۔ مگر آواز کا ٹھاٹ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں ایک لرزش سی ضرور آگئی تھی۔ جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کیونکہ مولوی ابل اس سے مہرالنساء کے لئے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لئے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا۔ اور کئی نوجوان اسے جچے بھی تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی ابل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہرالنساء سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے۔ اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ۔ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی ابل کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے ہیں جن سے مہرالنساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہوگا دوسرے تو بچوں کے لئے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی

کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پنیوں میں سے اچانک بھڑ
نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی اُبّل اور زیب النساء کی دعائیں رائگاں نہ گئیں ۔ انہی دنوں سابقہ خدایار اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ خدایار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی اُبّل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدایار کی بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی اُبّل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دوکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز مولوی اُبّل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لئے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا "عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا۔ تم کہو تو دلہن کے لئے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں، جہیز کے لئے ضرورت تو ہے ہی، ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی اس لئے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نورِ نظر ہے، تیسرے ——" مولوی اُبّل نے رُک کر

اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں - اللہ جل شانہٗ کی قسم، مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے جھرن ہی کے نئے آسمان پر سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النسا کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لئے تو بھوبھل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی - صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی ابل کے سامنے رکھ دیا "خدا تیری زبان مبارک کرے - میں تو جب بھی جھرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پرانا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا ہے!" وہ رونے لگی، ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی - اور جب مہر النساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھی "بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا - وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو، ورنہ سب ٹکڑے کوؤں میں بٹ جائیں گے جاؤ میری بیٹی"——— اور مہر النساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں، شمیم احمد کی دوکان پر ابا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہر النساء باہر چلی گئی تو مولوی ابل نے ڈبے کی کل متاع مبلغ پینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا "دعا کرنا جھرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لئے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی ابل شمیم احمد کی دوکان کو چل دیا سو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں زنگ رنگ کے کپڑوں

کے سامنے سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی اُبل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں پر بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی اُبل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھول تھے اور نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو" مولوی اُبل نے معمول سے ذرا بلند آواز میں کہا۔ اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی اُبل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت ہی —— محض تحفتہً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی اُبل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا۔ صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا۔ کھنکارا اور بولا "چھ روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دوکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی اُبل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جم کر رہ گئیں۔ مولوی اُبل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ نے یونہی فرمائی ہے اس لئے میں نے نرخ میں کوئی رعائت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر تلافی کر دوں گا انشاءاللہ تعالےٰ۔"

مولوی اُبل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد سے کہہ دے "اللہ جل شانہٗ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد، اس لئے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے" لیکن یہ تو ایک دم سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا، جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی! اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بے قراری اور چھبن کو دیکھ کر مولوی اُبل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری جہن کا سہاگ مہکے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی اُبل کے دروازے کی زنجیر بجی، اس وقت آنے والے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر وغیرہ لاتے تھے اس لئے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی اُبل کو کیا سوجھی خلافِ معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے، سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء تو رو بھی دی، مگر مولوی اُبل ان کو دلاسہ دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فوارہ سا امڈا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ"۔

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لئے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہ بند ٹین کی طرح بج اٹھا۔ اور جب اس نے رک رک کر کہا "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں (

قبلہ۔ اسی لیئے آپ کو بے وقت زحمت دی" تو مولوی اُبل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اٹھتی ہوئی مہک کچھ گنگناتی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی، لیکن مولوی اُبل گردن موڑ کر پکارا "میں ابھی آیا عارف کی ماں" اور پھر وہ شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو شیئے تہ بند کا شور و غوغا روکنے کے لیئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے، دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا، اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیئے مخصوص تھا شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی اُبل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لایا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس آیا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے خشخشی بالوں پر عطر حنا دیئے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

"کہو" مولوی اُبل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لیئے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی لو بے پناہ دھواں چھوڑ رہی تھی آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں"۔

"کہو۔ کہو" مولوی اُبل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے

دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیند سی رکھی تھیں! "کھو نا عزیزم"۔

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا "اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں، سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں"۔

"تم نے بہت اچھا کیا" مولوی ابل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پرانا خادم ہوں" شمیم احمد نے سمٹتے پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا "میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لئے ——" اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا ——"حضور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی غلامی میں لے لیں" شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی ابل کا جی چاہا کہ چٹکی بجا دے، رسماً ذرا ہنستے ہوئے بولا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد"۔

شمیم احمد نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی ابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دبی دبی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی "جی میرا

مطلب ہے کہ حضور ـــــ حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیں"

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی اُبل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا، اور جب مولوی اُبل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اٹھاکر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی اُبل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے رُک گئے تھے، شمیم احمد کی داڑھی پر عطر حنا چمک رہا تھا اور مولوی اُبل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لَو پھڑ پھڑ کر دھواں اگلنے لگی تھی، مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا، مولوی اُبل نے یکایک جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا" لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہ! ـــــ کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انہیں پرو لیا" دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے ـــــ آؤ، ادھر آؤ" ـــــ اور مولوی اُبل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہ دیا " کہاں سے آرہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آنے لگی ہیں "

مہرالنساء تو بے پر آخری دو تی ڈالے بیٹھی تھی بولی" سچ آپا جی، سارا گھر مہک اٹھا ہے "

"کیا بات ہے" زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی اَبُل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا اس لئے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے، سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لئے بولا "آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ڈلا بھی ملے گا۔" لٹکے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہر النساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

"بات سنو عارف کی ماں" مولوی اَبُل باہر جاتے ہوئے بولا:

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا "میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہو"

مولوی ابل چہکا "اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تُو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو اللہ جل شانہٗ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی!" اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پہ ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی، وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی بھیگی بھیگی داڑھی رکھ دی۔

"دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں" مولوی اَبُل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا "الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا۔ یوں دیتا ہے چھپر پھاڑ کے۔ سنتی ہو زیبن" آج مولوی اَبُل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے بجائے زیبن کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "جب شمیم احمد خدا یار تھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا مہران کو جیسے ــــ کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو ــــ اللہ قسم"۔

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

"ٹھہرو" اب کے مولوی اُبل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی "میں خود جاؤں گا" پھر بچوں کے پاس آکر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا "ندیدہ پن بہت بُرا ہوتا ہے۔ سمجھے؟ ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی آ نکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ" پھر ذرا بلند آواز میں بولا۔ "انہیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں"۔

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی اُبل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا "مبارک ہو قبلہ! ہزار بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں"۔

اس وقت مولوی اُبل کی نظروں میں چودھری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پر دل کی کمی رہ گئی تھی "اللہ جل شانہٗ کا شکر اور آپ کا احسان ہے" اس نے چودھری سے بڑے پنکھے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

"خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا" چودھری فتح داد بولا "اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجیے، شمیم احمد اچھا لڑکا ہے، پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دوکان دار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں اور

آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا ننگا زمانہ آ لگا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب بڑے بڑے بھک سے ہو جائیں۔ شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے، کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں تو مُم ڈالتی ہے کمبخت۔ ابھی ابھی شمیم نے آ کر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے، میں نے اسے جلدی سے شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجئے، سو میں اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے اور یہ ـــــ یہ ـــــ" چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی ـــ "یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا"۔

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ قبول فرمائے"۔

"آمین" مولوی ابل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آ کر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے۔ جن کی بڑے سے بلبلے جتنی کٹوریوں میں جانے نگینے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اندیشے کی امید میں رومال کو جھاڑ کر جھکی "شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟"

اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ مہرالنساء بھاگ کر باہر نکل گئی۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النساء کی طرف دیکھا اور پھر

دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دبکتے ہوئے انگشتِ شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔

"تم نے بھی تو منہ بھر کر کہہ دیا ــــ شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟ ــــ"

مولوی اُبل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے، محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے، عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھمکوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چودھری فتح داد دے گیا ہے۔ مہرن کے لئے" مولوی اُبل نے بڑی بے پروائی اور روا روی میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے پیروں پر مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی کیونکہ شادی کا گھر سہی پر آخر مولوی ابو البرکات کا گھر تھا جس نے حضور پرُ نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دفیں بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا" مولوی اُبل نے میراثنوں کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہر النساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک

کے بغیر ہی اپنی سریلی الاپوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دشمنی، پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گولے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی اُبل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی اُبل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی اُبل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے گھسٹنے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں۔ اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کا گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

"مولوی کے پاس دستِ غیب کا تعویذ ہے" کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلی میں انگلی ڈبو کر کہا "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لئے ہیں، کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پہ ملے تھے۔ سگھڑ ہے اس لئے اولاد کے لئے رکھ چھوڑے۔ یہ کنگن اور یہ ناک کی کیل۔ یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟" اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہر النساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکیلے میں اور چھوہاروں کی ایک لہر سی اس پہ سے

نچھاور ہو گئیں۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے، مولوی اُبل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے ایک دم اپنی جگہ سے یوں اچھلے جیسے ان کے قدموں تلے بجلی کے تار کمانیاں ابھر آئی ہیں "ٹھہرو" مولوی اُبل گرجا۔ کمانیاں دھرتی میں اتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنّی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا۔ اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا بہ اٹھانہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی اُبل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی اُبل گلاب ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہروں کے لئے بانٹ لیا ہے، ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کھینچا یا اور پلٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈھ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی اُبل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور کھجلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنّی چمکتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔

زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی، مولوی اُبل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے دائرے بنا کر بولی" ہمارے لئے تو بس یہ قبرستان کا سا سناٹا چھوڑ گئی ہماری جھرن۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" مولوی اُبل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا "جھرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا تم بھی اس کے ساتھ چلی گئیں؟" پھر ذرا سا رک کر بولا" عارف میاں! زبدہ کیا کر رہی ہے؟"

"جی رو رہی ہے" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی اُبل نے پوچھا۔

"جی جہاں جھرن آپا مایوں بیٹھی تھیں" عارف بولا۔

"زبدہ" مولوی اُبل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ دروازے پر نمودار ہوئی، نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سے سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا۔ اور زبدہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چمکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور ——

مگر مولوی اُبل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آ گیا تھا مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرے پر زردی پھیل گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم چل کر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی اُبل نے زیب النساء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جاکر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے "عارف کی ماں! سنو، یہ زبدہ تو نوجوان ہوگئی ہے!"

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہران کے عقب میں بیٹھی پلتی بڑھتی رہی تھی

کچھ دیر کے بعد مولوی اُبل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "فکر نہ کرو بیوی، اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔

زیب النساء نے مولوی اُبل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر گرا دیا "شرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے، اب کندھا سہار رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے ——" زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی اُبل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا "شمس!"

شمس النساء فضاء میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی اُبل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لئے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی ٹھہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی پھر تلوے کا خم جھکتا تھا اور

اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لچک لچک کر دھرتی کو چھوتی تھیں تب جاکر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی۔ کچھ نہیں۔ جاؤ" مولوی اُبل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النساء زار زار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمس اس کی طرف لپکیں

مولوی اُبل نے باہر جاکر چوروں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکنی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قمرن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے نھول کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لئے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد آنے جانے لگے تھے۔

نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی اُبل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین کی خدمت کے برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا تمہیں یاد ہو گا کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے

ہی گاؤں کو زمین نگل گئی! کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہرِ الٰہی ہے۔ یہ آثارِ قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ! ——"

اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد معتقدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے۔ مگر پھر وہی سناٹا عود کر آتا جس میں زبدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمس کا جسم لچکتا، ٹین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری بنٹے بجتے اور تالیاں بجاتے۔ اور قمرن کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتیں۔

مولوی ابل کے صرف دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹتے۔ اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی ابل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور مہرالنساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبدہ اور شمس کے لئے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہرالنساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت سے وہ زبدۃ النساء اور شمس النساء کے لئے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ "ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے تو ابھی تک قرآن مجید ہی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی پوئی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر بھیج دوں؟ زبانِ دہان نہیں دوں گا۔

اگلے سال دیکھا جائے گا"۔

"دیکھا جائے گا" وہ زیب النساء سے زبدہ اور شمس پر بے تحاشہ آئی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا "اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا۔ توکل بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکل بیج کو کھینچتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور سبز پتیوں کی گود میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے، سمجھیں عارف کی ماں؟"

"پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النساء بحث کرتی "تم نے کیا کیا ہے؟"

"الحمد للہ" مولوی ابل کہتا "میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں!"

اور زیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعاؤں کے بعد مولوی ابل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا۔ اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پوشاک پہنائی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جراحی کا کام کرتا تھا، چودھری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سوج کر پھوٹ پڑا اور رسنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری کو لرزے کے بخار نے آلیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان دنوں مولوی ابل کے

گھر پر مردنی سی چھائی رہتی - ایک تو مہرالنساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سو ہان روح تھا اس پر چودھری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی اُبل چیخ اٹھتا "چپ رہو نامرادو! ادھر چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل رہے ہو، ناشکرو! یہ چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے - اللہ جل شانہ' کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"

مولوی اُبل ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا. لیکن وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھڑی بات نہ ہو سکی. بس اتنا ہوتا کہ مولوی اُبل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا "دعا فرمایئے قبلہ" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی اُبل آنسو لاکر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا "وہی شافیٔ مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا" —— لیکن ایک روز جب مولوی اُبل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا. چودھری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی- آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا لیکن کراہا نہیں- لڑکے کو اشارہ کرکے باہر بھیج دیا اور بولا "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟"

"الحمدللہ- اچھی ہیں - دعا گو ہیں" مولوی اُبل نے جواب دیا-

"سنا ہے بہت پیغام آرہے ہیں؟" چودھری نے پوچھا-

مولوی اُبل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں - وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے

تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آرہے ہیں"

"پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چودھری مسلسل مولوی اُبل کو دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی اُبل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو، زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا "جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہٗ ہی کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لئے تنکا تک نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کون طے کرتا پھرے۔"

"تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟" چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی تھراہٹ تھی۔

"آپ کے دشمن مریں" مولوی اُبل فوراً بول اٹھا "آپ اللہ جل شانہٗ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر دونوں بیٹھ کر طے کر لیں گے۔"

"جی ہاں" چودھری نے ہمدردانہ انداز میں کہا "فوراً طے ہونا چاہئے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا ــــــ وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟"

"جی ہاں" مولوی اُبل نے جواب دیا "باقاعدہ"

"اللہ قبول فرمائے" چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

"آمین" مولوی اُبل نے عادتاً اس دعا کی تائید کر دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا "سنا ہے بیٹی مہر النساء اور شمیم احمد کی خوب نبھ رہی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی"

"جی ہاں" مولوی اُبل نے بڑے دکھ سے کہا "لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے"

"پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے، تو کنگلی ہے، تو سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے، تو اپنے ساتھ خاک لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں" چودھری کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقعہ ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہر النساء کو کنگلی کہتی ہے نا؛ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لئے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے، مولوی ابل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النساء سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور زیب النساء نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے بیٹوں کو ٹوٹتے پھرتے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی ابل ڈیوڑھی ہی سے پکارا "عارف کی ماں!"

زیب النساء بھاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا" مولوی اُبل بولا "عارف کی ماں! سنو، مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

زیب النساء چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہو گا؟" مولوی اُبل تو آج آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا تو آج کل ہیں" زیب النساء جھینپ کر بولی "پر تمہیں کس نے بتایا؟"

مولوی اُبل تقریر کے سے انداز میں بولا "یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے طعنوں تشنوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لئے بہت سا ——"

"اللہ کرے نواسہ ہو" زیب النساء نے مولوی اُبل کی بات کاٹ دی

"جو کچھ بھی ہو" مولوی اُبل نے ٹوٹے تار کو جوڑا "ہم بچے کے لئے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کے لئے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"توکل عارف کی ماں۔ توکل" مولوی اُبل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا "اللہ جل شانہ پر تکیہ کرو" خود مولوی اُبل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقعہ اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہرالنساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ

سے بولی "جاگ رہے ہو عارف کے ابا!"

"ہاں عارف کی ماں۔کیوں؟" مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے جہرن بیٹی۔شمیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔شاید کل تک ہو جائے گا۔" زیب النساء نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ اماں؟" زبدہ تڑپ کر بستر پہ اٹھ بیٹھی۔

"ارے!" مولوی ابل اور زیب النساء حیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پہ مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔جہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔سارا گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النساء کے پاس آیا "اب کیا ہو گا؟"

"چودھری کیسا ہے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہ، ہی رحم فرمائے" مولوی ابل نے کہا۔

زیب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو جھونکو بھاڑ میں۔میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چھوٹا چھینی ہی بنوا لیں تو ناک رہ جائے۔کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل؟" مولوی ابل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ

تھا۔ تمہاری عقل بھی تو ایڑیوں میں ہے۔ اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے۔ آخر ایک بھو کے مرچھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لئے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ — نہیں ہے کوئی سبیل۔ کنگن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر تو اسے کو پہنا دیتا"

"بکنے کیوں لگے؟" زیب النساء بھی غصے میں بولی "کنگن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہو گا کہ خالی ہاتھ مٹکاتی دھرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آجاؤں لعنتوں کی گٹھری اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو گا۔ جینا اجیرن ہو جائے گا۔ میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زبدہ اور شمسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اُگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں، ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں" مولوی اُبل طیش میں آ گیا "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کنگن ونگن نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے؟ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں؟ میرے پاس کچھ نہیں" مولوی اُبل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آجائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز

آئی تو وہ بلبلا کر رو دی۔ اور زبدۃ النساء اور شمس النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ اور زبدہ اور شمس اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا۔ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا "ادھر آؤ۔"

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب تک مولوی ابل موم ہو چکا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو جھرن کے ہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خالی ہاتھ؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو" زیب النساء بولی "کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا؟"

مولوی ابّل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے، تھکے ہوئے لہجے میں بولا "ابوالبرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لئے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا۔"

زیب النساء بڑی مہارت سے امڈتے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی "چودھری کیسا ہے ؟"

"وہیں جا تا ہوں" مولوی ابل نے جماہی لے کر کہا "ذرا سا بھی اچھا ہوا تو مہرن کا مزور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہ' کوئی سبیل پیدا کر دے"۔

مولوی ابل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبدہ اور شمسن نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار۔۔۔

انتظار۔۔۔

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی ابل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا "عارف کی ماں اے عارف کی ماں"۔

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبدہ، شمسن، عارف، قمرن، عمدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انہیں اٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی ابل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھیں ۔ اللہ جل شانہ نے چولے ہی نہیں اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا ۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا ——— چودھری فتح داد مر گیا ہے نا"

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا کہ بنچے تک ڈھیل کر دیئے ۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے ، اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں ۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مردے کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا ، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا ۔

کنجری

سرور گھر میں داخل ہُوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، گلے کی رگیں پھول رہی تھیں جیسے ساری باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کو کھولنے کا وقفہ خبر کے بھاری بھر کم پن میں حارج ہو سکتا تھا "اماں" وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا" وہ برساتی نالے سے پرلے محلے میں جو لڑکی رہتی تھی نا؟ بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے؟ ——" ہاں ہاں، ہاں ہاں" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ "وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمالاں خاتون سے ہو بہو ملتی ہے" اس نے کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولھے کے پاس اپلوں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی۔

اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پُر کیا — "ہو بہو کماں کہا تھا میں نے ؟ ہماری
کمالاں خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔
شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، پر ہماری
بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں۔ اور پھر ہماری کمالاں کے
اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو
عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح کو آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات
چیت، چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا
بھر دیا ہے، پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ کہاں اس میں" — بڑھیا کی باتوں کے
دوران میں سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلتے ہوئے
اُپلوں میں دستپنا ٹھونس ٹھونس کر ہر طرف پھڑپھڑپن سے آگ بھبھرتی رہی۔ اور جب
بڑھیا ڈلی پھانکنے کے لئے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔
"تو اماں۔ وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی جس
کے —" بڑھیا پیڑھی سمیت اُچک کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی "بھاگ
گئی؟ اے سبحان اللہ، میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے پردادے
کو، اور لعنت اس کے باپ پر جو اسے سکول کے سوکھے سڑے لٹے جڑے
منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟" — بڑھیا نے
کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولھے میں مسلسل پھونکیں مارے جا رہی تھی اور کڑوا
رُلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا۔ سرور بولا "اس زمیندار کے ساتھ
جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے

بیٹھ کر اسے آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے!" اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی "معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا تھا بیگماں نے ۔ جیتی سرو بیٹے، ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے، ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں ـــــ اہاہا ۔ لگتا ہے میں دس برس ابھی اور جیوں گی ۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے ۔ جیو میرے سرو، کیسی گھی میں تر تراتی خبر لائے ہو تم ـــ کیوں کمالاں بیٹی ؟ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولھے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کے اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اُپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی ۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا اور سرور نے مسکرا کر کہا "کچی ہے ابھی" ـــ کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی "دال نا؟" ـــــ اور جب کمالاں ہنڈیا لئے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے گنگنانے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا ۔ "ہاں" وہ بولی "آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا۔"

یہ تر تراتی ہوئی خبر کمالاں کے لئے نئی نہیں تھی، اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انہیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی "پھر کیا ہوا ابا؟" اور سرور جواب میں کہتا "پھر کمال خاتون بٹیا! پھر کیا ہونا تھا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں

توڑے گی، بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ پھر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے۔ میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا اماں کی قسم" — کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی، پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پہ چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولھا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خان گاؤں کا کھاتا پیتا دوکاندار تھا، کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خان نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنوئیں ہی کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خان صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جانے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خان صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ خان صاحب سہراب خان پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لئے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سادے گاؤں کی ایک ٹھاٹھ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی، البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اُڑا دی، یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی، اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خان کی یہ نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔" میں نے تاجی کو نواب رن مست خان کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!" دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری

جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خان صاحب کی وہی ناجی ہے۔ کنجری"۔

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا "کنجری۔ کنجری!" سہراب خان کی دوکان اُجڑ گئی۔ وہ دوکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پانی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خان صاحب سہراب خان اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ ناجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے ایک تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے۔ اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے۔ کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں، انہیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے۔ ناجی نے گاؤں میں کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پُر امن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان یاریوں دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لئے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی۔ بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خان پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ ننانا

سار ہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لئے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہوا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے، ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لئے۔ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان سے چرس لا کر بھی بیچتے رہے مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لئے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے، ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی ان کے ہتھے نہ چڑھی، آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ بولی "سرو بیٹے۔ وہ ہماری کمال خاتون اگر زندہ ہوئی تو اب کے برس کی ہوگی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو ———" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی، تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔

اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلےٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک گنگنتے رہے اور کہتے رہے "پیڑ کا رُخ غلط ہے، تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ ہی دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑ سے ٹوٹ جاتا۔ پیڑ کا رُخ متعین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لئے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے، مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ دیکھ سرو بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو۔ قد کیسا بوٹا سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے، ہونٹ دیکھو، لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں، اور آنکھیں! یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا ان میں۔ اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔ اور تمہارے سر کی قسم میں سمجھی گلگتے والی گوہر جان پھر زندہ ہو گئی۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان۔ میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔"

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا، اگرچہ مصلےٰ پھٹ جانے

کے بعد دوسرا مصلّے بچھایا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے، کئی بار اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا "تم نہیں جانتیں بیٹا۔ جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤ گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی۔ پر اب تو نہیں کھیلتیں نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنوئیں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھیں۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی آتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی، جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور تم اندھیرے میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی۔ سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے۔"

"بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے!" بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا "یہاں ایک ایک دن ایک ایک مہینہ بن رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے، تم بھی کمال کرتی ہو اماں۔ ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا۔ پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں، جس کے ہاتھ بھی افیم بیچتا ہوں، وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے، مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں اور اوڑھیں پہنیں ویسے

بھی دل کچھ ہولایا سا رہتا ہے، سوچتا ہوں کمالو چھکلے لائق نہیں، اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے ناماں - وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نوبہار میں"

بڑھیا بیٹے کی یہ باتیں سن کر ہنس دیتی مدارسے پیکلے کہیں تو بھی مولوی تو نہیں بنا جارہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی، ہوتی ہے پر غائب ہو جاتی ہے - بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کر کہ یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہوگا - پگلا لا آج کی افیم لا"

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولھے پر رکھ کر پانی کے ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے، اور یہ پانی اس زور اُبلا جب کنوئیں پر جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان نادرے نے چھیڑ دیا- وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا "حسبی اللہ حسبی اللہ" کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی - پلٹ کر بولی "اپنی بہنوں کو جا کے چھیڑ" نوجوان مسکرا کر بولا "میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربان" کمالاں نے کڑک کر کہا "تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا" نوجوان ہنس کر بولا "وہ تو مر چکی ہے پیارو" کمالاں آپے سے باہر ہو گئی - نادرے کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنوئیں کی جگت خالی ہو گئی - لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں - نادرا لپک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا "آخر کنجری ہو نا کنجری!" ــــ وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، گنگنیں اور

پھر زور زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی، پہلے تو دیر تک بلک بلک کر روتی رہی پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے کرو بیٹے!" تو دونوں ایک ساتھ ہنس دئے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی، کنوئیں پر جا کر گھر میں سنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نوعمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں "آخر کنجری ہے نا کنجری" یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنا بٹوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبریں سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی، بڑھیا تاجی اور سردار یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے "ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری بڑی بڑی شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا" بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی، ان قلعوں کے

دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی، مسکراتی، اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی، اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی "اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بیٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے،" وہ سوتی ہوئی کمالاں کے پاس آکر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی "ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے، دیکھنا تو اپنی بیٹی کو، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی چیدھی کھلواتی" پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹر دل، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی؛ کسی نے اسے بتایا کہ حسن قادر سے نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ ایک اور نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے، کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ "تیرے نام پر لڑائی ہو گئی۔ قادرا تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کہہ رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو نا؟ اری یہی ابر دفوجی" تو کمالاں کو گھمری سی آگئی اور اس کے بعد وہ احساس جمال اور احساس محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی؛ افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہو گئی اور جماہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں بھی اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کرید کرید

کر نہیں پوچھتی تھی تو گھر میں تر تراتی خبریں سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی، جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آ گئی۔ رات کو جب حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انہوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو "درگئی" میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے۔ اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا "چوٹ لگی ہے۔ صاف چوٹ لگی ہے، تمہاری ہی قسم بیٹا، چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سایہ اتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے، ہاہاہا، لطف آگیا!" امید دل کے پھول جنہوں نے اب تک سر نیہوڑا لیا تھا، تر و تازہ ہو کر سربلند ہو گئے۔ اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہوتے ہوتے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوتی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی، دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینک میں گم رہتی تھی یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی چباتی رہتی اور سرور موچیوں، جلاہوں کی دوکانوں پر میٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھبرا کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے، جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات

گئے تنک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے، لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہِ راست اور دو ٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لئے کہتے۔ بس جال بچھاتے رہے، دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی، بعض وقت سرور تنگ آکر کہتا "اماں! اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں، ایک بار شمشاد، رنو بہار اور امیر وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے" مگر بڑھیا ناجی دور اندیشی سے کہتی "نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا، پک جانے دو، آپ ہی آپ ٹپکنے دو۔ اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودہ کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی۔ جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی، آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے جائیں۔ بیٹھے بیٹھے، نہ بیٹھے نہ بیٹھے، یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال۔ ذرا سا اور دیکھ لو"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا"

بڑھیا بولی "میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرو بیٹا خالی سا آ رہا ہے"۔

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا۔ گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا۔ میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کس کے جی میں کتنا گھرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کے چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کے چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کے چلو پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے نظریں اٹھا کر چلا کرو۔ سو آج میں گئے جولاہے کے ہاں قیمہ بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جب میں کھنڈر کی دیوار پر سے جھانکتا ہوں تو حضرت نمازی نواز وہاں بیٹھا ہے۔ اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا "کیوں میاں، نماز پڑھ رہے ہو؟" مجھے ماں بہن کی گالی دے کر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ مراثی کا کھنڈر ہے؟" پرا مال! مجھ سے چھپانے سے چھپتی تو نہ پھر بدنام ہوتی۔ سو میں نے واپس آ کر موری والی دوکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا ہے۔ میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو کھنڈر میں دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دوکان پر کوئی بول گیا۔ سامنے ہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے۔ "مجھ پر کل تہمت کیوں لگائی؟" اس نے پوچھی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بدمعاشی ہے ان کی جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔ بڑے آئے پرہیزگاری لگانے والے چھپ چھپ

کے ملتے ہیں اور ــــ حرامزادے!"

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کر ملنے سے کیا تکلیف ہوئی، وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے نا کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا۔ اور پھر ــــ

بڑھیا کی آواز نے اس کو چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھرتے ہیں ماں کے لاڈلے، دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا دنیا بھر کے سامنے، مزا آیا نا عشق کرنے کا۔"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لئے دادی اور ربابا دونوں "جی۔جی" کہتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہِ راست پر لانے کے لئے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی ــــ سن، بات یہ ــــ"

مگر سردو نے ماں کی بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بیٹیا! کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے" کمالاں نے پوچھا۔

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو، ملوگی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا بات ہے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات۔ ہاں تو بتاؤ بیٹی، جواب دو۔ ملو گی؟"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی، چکرا سی گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "ہاں! پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا۔"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل ـــ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں!"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "حرامزادی"

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک ماں بیٹے میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی، آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور

پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے ۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرزِ عمل بہت بدلا بدلا سا تھا ۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی ۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے دادی ؟"

"ارے بیٹیا ! کوئی خاص بات نہیں" بڑھیا بولی "جوانی کم بخت یاد آ رہی ہے ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر انہیں سر پہ بنا کے رکھ دوں ۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر باہر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی ، انہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں ، اسی لئے ذرا اداس ہو رہی ہوں"

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا "کیا بات ہے بابا ؟"

"آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹیا" وہ بولا "ذرا سی افیم تھی اسے ادھر ادھر کیا ہے کہ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے ، افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں کے تینوں ناقوں مر جائیں گے ۔ بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا ۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی ، نیچ سمجھتے ہیں ہمیں ، اس لئے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خواہ مخواہ"

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہُوا پر کیسا پنجر ملا ہُوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے کلّے، کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنوئیں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوُا؟ نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی۔ عبادت سے نصیبے بدلتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارہ میرا بابا! ——
وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی۔

اور شام کو کھانا کھاتے کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا "اماں، اماں!!"

"دادی۔ دادی" کمالاں چلائی۔

"بیٹی۔ بیٹی" بڑھیا کراہی "درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کرو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی، قولنج لگتی ہے۔ اے کسی سیانے کو بلواؤ بیٹا کسی سیانے کو بلواؤ"

سرور نے بڑھیا کو اُٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا "قولنج ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے —— جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے۔ پر جانے کہاں

دیکھی ہے۔"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں"

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنوار ہے، میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے۔ "جلدی سے یاد کر و ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی"

سرور گھبراہٹ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

اچانک بڑھیا بولی "سلطانے کے کھنڈر میں؟"

اور سرور نے تالی بجادی "جیو اماں، کیا وقت پہ یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لئے اس نے پگڑی سر پہ لپیٹنا شروع کی۔

بڑھیا کراہی "تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی"

"میں چلی جاؤں گی بابا" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا "دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اُگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی بھی اُگ رہی ہے۔

ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"

"اچھا بابا۔ بس بس پلک جھپکنے میں آئی" کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈروں کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی، مگر صرف "ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آرہی تھی، کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھسٹتے ہوئے تہ بند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی، آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے۔ خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکایک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی "آگئیں میری جان"۔۔۔ چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا "میں جانتا تھا تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی۔ اور آخر آج ۔۔۔۔" کمالاں اتنی قوت سے

جست سی لگاکر کوٹھری کے باہر آرہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی، اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے، وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آ رہی ہے۔ لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی، تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آجانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے، گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی اور وہ کیسے کراہے، کمالاں نے سوچا۔ بابا اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور ——— کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے، قادر کے بس میں آگئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڑپھڑا کر بھاگنی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چلی ہیں اب بھی چاند نہ ابھرا تو سمجھو یہ رات ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آگئی جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا "قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگے تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی، پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کم بخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ کبھی گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی"

"پر بیٹا" دادی نے کہا "تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب بہت اچھی سوچی ہے"

کواڑوں کو جیسے کسی نے پٹخ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انہوں نے دیئے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا "لوٹ آئیں بیٹا؟" —— کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو پوچھنے کے لئے بڑھی ہے۔ سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور بابا کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب اُدھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رکی تو اِدھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا۔ اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی

تو باہر آنگن میں نکل جاتی، وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگی آتی۔ سونے کی کوشش کرتی، بھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی اور جب صبح سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا "اماں سچ مچ کہ جھوٹ موٹ ؟"

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی "تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا ؟"

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں ماں! معاف کر دو۔ تو کیا سچ مچ بیمار ہو ؟"

بڑھیا نے کہا "پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں سی چل رہی ہیں"

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا "میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا"

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی۔ کافی دیر کے بعد وہ پکاری "بیٹا کمال خاتون "۔

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

"بیٹا" بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

"ایک پیالی چائے مل جائے گی ؟" اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا "یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکا نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے، کہتا ہے دوا تم منگا لو ٹیکا میں لگا دوں گا۔ تیس چالیس لگتے ہیں۔"

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکا لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کئے، مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفےٰ دے کر ڈاکٹر بن گیا تھا، مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پٹخ پٹخ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے کو بلاتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو، اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا، خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لئے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ

کانپنے لگے اور وہ اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال ادھر ادھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا۔ سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ باندھ دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لئے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی" —— اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے، پگڑی بدن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسے اسے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور ہونٹ ذرا سا اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ کتنا ٹھنڈا تھا

تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورۂ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں۔ "دادی!" وہ چیخ کی حد تک چلائی۔ "بابا!" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آکر بیٹھ گیا۔ یہ بوڑھی دادی تھی، کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کئے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلیس سی نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے۔ یک لخت اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں۔ "دادی!" وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا "اٹھو میری بیٹی! جاگو۔ آنکھیں کھولو۔ اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟"

"میں ڈر گئی تھی بابا" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے، کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مؤدبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا، مسکرائے اور اشارے سے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی

انہوں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لئے کہا اور وہ ایک سعادتمند بچی کی طرح سورۂ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں پڑوس، محلہ والوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں، چپکے سے کوٹھے میں چلا گیا۔ خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھے میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "بابا! ——— اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ "بابا!" وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی "بابا!"

سرور بے اختیار رونے لگا اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہ نکلے اور پھر وہ بڑی

ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بیٹی! دیکھو۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں!" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لئے اور سر پیٹ لیا "میں بڑا ذلیل، کتا، خبیث، کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ——— اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں، کتنا کمینہ! سچ مچ کا کنجر" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لئے کوئی لفظ نہ سوجھا بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا پھسلا کر چپ کراتی، تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا۔ تم نے کونسی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیئے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈھ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی "تمہیں تو بخار ہے بابا!"

"ہاں بیٹی!" وہ بولا "ادھر دونوں پسلیوں میں جلن سی بھی ہے۔"

کمالاں سناٹے میں آگئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی گھورتی

تلے سے ایک پٹی بھی گذرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی "نہیں بابا! تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا— نہیں —— نہیں" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا "نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا۔ پھر بیٹے پر حق ہو گا میرا"۔

کمالاں کے سوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انہی بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

"بخش دو بیٹا!" سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انہیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا "اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ —— کہنا پسلی کا درد ہے، دونوں طرف۔ ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب ہیں۔ جاؤ میری بیٹیا! —— پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ کر مسکرا کر"۔

کمالاں پھر مسکرائی "یوں" اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا "الٰہی تیرا شکر ہے"۔

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں:

پر جو مریض ٹیکا لگوا تا ہے وہ بچ جاتا ہے" باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کر دیجیے؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس میں" ڈاکٹر بولا "پنسلین نام ہے، قصبے میں مل جائے گا"

واپس گھر آکر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر وہ بابا کے پاس بیٹھی رہی، سوتی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے، سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے سفوف کی تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی سرخ سرخ آنکھیں، اُجڑے بال، خشک ہونٹ، جیسے کہیں سے پٹ کر آرہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے؟" وہ بڑے غصے سے بولا "ٹیکا لاؤ ٹیکا، سمجھیں؟ اب کی ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا "ٹیکا!" وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔
اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لئے کھاٹ کے پائے کا سہارا لئے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اُٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی۔ وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکا!" سرور پھر سے ہنسا "کہتا ہے ٹیکا لاؤ، ڈاکٹر بنا پھرتا ہے۔ ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی! دیکھو، میری طرف دیکھو۔ میں مروں وروں گا نہیں"۔

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر نکل گئی، گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے "تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو ابراہیم، ملتے ہی نہیں!"

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "تمہارے حکم کا انتظار تھا"۔

"تو پھر آج ملو" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر ہی میں" پھر ذرا سا رُک کر بولی "دادی تو مر گئی ہے نا"۔
"کب آؤں؟"

"بس "لوگ سونے" آجاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لئے، بے دھڑک آنا۔ بابا بیمار ہے، بے ہوش پڑا ہے"۔

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے اور ادھر کمالاں جی اڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کر دیجی، ڈر لگتا ہے"۔

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دبانے لگی اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھڑی میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر دہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی، اور "لوگ سونے" تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آکر اس نے آہستہ سے کہا "کمالی!"

"ایں!" وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی "ارے! تم آ گئے!" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی ——

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر

آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی!" سرور دوسرے کوٹھے میں رو دیا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا: "اب چلیں پیاری"۔

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی!" سرور ادھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ "کل پھر ملیں گے میری جان!"

اور آخر کمالاں بولی "کل تو پھر ملیں گے پر آج کی اجرت کہاں ہے؟"

"اجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اجرت مانگتی ہے؟ عاشقی کی اجرت مانگتی ہے؟ شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا، کنجری!"

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا، طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں" چن لی تھیں۔ "پڑ کوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے، انھوں نے رنگین لنگوٹیں کس کر باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرّے بنا رہے تھے، وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں، یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدت سے تیل چپڑوا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا، پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آئے، انھوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے ساتھ ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم

گئی" مولا کہاں ہے؟"

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھیچے چلے آئے تھے۔" مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!" دوسرا بھنور پیدا ہُوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھنے لگے، جما ہُوا "پڑ" ٹوٹ گیا۔ منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا، مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہو لئے، ___ اور پھر اتنے میں جیسے میدان میں سیروں بارود سے بھرا ہُوا گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آگیا تھا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے دقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر "یا علی" کا نعرہ لگانے کے لئے ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھمادھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی۔" مولے۔ اے مولے بیٹے۔ تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اٹھا ہُوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے۔" رنگے نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے،

ہجوم میں افراتفری پیدا ہو گئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی والا تانبا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھری سینہ سے لگائے بھاگا آ رہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوفزدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے "رک جا مولے!"——

مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لئے گئے، اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے "تو آگے نہیں جائے گا مولے"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر بولا "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"

"میں کہہ رہا ہوں" پیر جی "میں" پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔

مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالئے اور ناک بھی کاٹ ڈالئے میری، مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی! بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا"

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف

دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈا سے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے، رنگے کا بڑا لڑکا بولا "آؤ بیٹے آؤ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اُگل ڈالو تو قادر انام نہیں، میرا گنڈاسا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔"

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل بہ چپڑ رکھا تھا اس لئے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا مگر پھر جکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کئے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے "اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ورنہ بدبختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا جاؤ، تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ، قرآنِ پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔"

لوگ سر جھکا کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تہمد سے پٹکا لے کر ادب سے اپنے گھٹنے چھپا لئے اور سیڑھیوں پر سے اتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لئے اس کے پاس آئے اور بولے "اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے۔"

مولا آگے بڑھ گیا" تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپالی پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" تاجے نے بڑے دُکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا" تو کیا اب رُوؤں بھی نہیں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

"ہاں تاجے" مولا نے دوسری بار بازو کو آنکھوں پر رگڑا "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے، میرے باپ کے خون پر مکھیاں اُڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لئے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اُس کے باپ کی لاش کو تھانے اٹھا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے، مُنہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اُس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر مُنہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اُس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپالی پر قیامت مچ گئی، رنگا چوپالی کی بیٹھک پر سے اُتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے

پھٹے ہوئے پیٹ میں سے باہر ابل کر اس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لئے گاؤں سے نکلے مگر جب وہ تھانہ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قُل ہو اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانیدار سے انہوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا مگر تھانیدار نے انہیں سمجھایا کہ "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قتل کو ضائع کر بیٹھو گے کوئی عقل کی بات کرو۔ ادھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے ادھر تمہارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھی بھونک آیا ہے؟"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے، لیکن دونوں قتلوں کا وافر چشم دیدہ ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا اور کہا "اس روز تم اور تمہارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا۔ تمہاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا ہے تو ایسا لگا جیسے گھوڑے کو بھی قتل کا پتہ چل گیا ہے آندھی بن گیا خدا کی قسم۔ اسی لئے تو لاش ابھی تھانے نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر واپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے مگر مولے کے چند

عزیزوں اور ماجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہُوا کیسے ؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادرے کے گنڈاسے سے مرا تھا۔ رنگا تو صرف ہشکارہا تھا بیٹوں کو، رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتہ چلا کہ قادرا اپنے کوٹھے کی چھت پر مردہ پایا گیا ہے، اور وہ بھی یوں کہ جب اُس کے بھائیوں پچھلے اور گلے نے اسے اُٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی، مولا پھر گرفتار ہو گیا، مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا، کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا، مگر وہ اقبالی نہ ہُوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آنکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی۔ اُس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے، اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اُس کی مونچھوں میں دو دو بل آگئے تھے، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی مُرکیں جھمجھمانے لگی تھیں، آنکھوں میں سُرمے کی دھار کو کبھی کسی نے مٹا ہؤا نہ دیکھا، خوشبودار تیل اُس کے لہریئے بالوں میں آگ کی قلمیں سی جلائے رکھتا، ہاتھی دانت کا ہلالی کنگھا اُڑس کر اُس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا، وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہ بند کا کم از کم آدھا گز

تو اُس کے عقب میں لوٹتا ہُوا جاتا۔ باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا اور اکثر اس کا ایک سرا گر کر زمین پر گھسٹنے لگتا، اور گھسٹتا چلا جاتا۔ مولا کے ہاتھ میں ہمیشہ اُس کے قد سے بھی کہیں لمبی تیل پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اُس کے گھٹنے سے لگتی اُسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لئے کہہ سکیں، اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے، مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے، عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے الانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اُس گلی میں سے گزر ہُوا۔ مولا اس وقت ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسری دیوار کو کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے الانگ گیا۔ ایکا ایکی مولا نے بپھر کر ٹینک میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا "ٹھہر جاؤ چھوکرے، جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ لانگی ہے؟ یہ مولا کی لٹھ ہے۔ مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سُنتے ہی یکلخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا "مجھے پتہ نہیں تھا مولے۔"

مولا نے گنڈاسا اتار کر ٹینک میں اڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا "تو پھر جا اپنا کام کر۔" اور پھر وہ لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور مرکیں، اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی، تیل پلی، پیتل کے کوکوں سے اٹی ہوئی، لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی، گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ، اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ٹینک تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی، لوگ کہتے تھے مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے پھلے اور رنگلے کی راہ تکتا رہتا ہے۔ رفادرے کے قتل اور مولا کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا اور رنگلے نے علاقہ کے مشہور رسّہ گیر چودھری مظفر الٰہی کے ہاں پناہ لی تھی۔ جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کر کے لاتا، چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں، وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری مظفر کے قصبے کے قریب تک پہنچتے تو جی میں کہتے، "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!" انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک ہے گئے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کے بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چودھری کے خوف کے مارے

قصبے کے ایک طرف سے نکل کر اور نخلوں کے رستے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے "یکھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!"

مولا نے چودھری مظفر اور اُس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا، اسے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں صرف یہ چودھری ہی ہے جو اس کی لٹھ الانگ سکتا ہے، لیکن فی الحال اسے رنگمے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

"ناجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے" کام نہ کاج کا دشمن اناج کا!" ناجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا۔" اور کچھ نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر، یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میرا سیدوں نائیوں سے خدمتیں لی جا رہی ہیں، تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے لے کر ڈرانے لگی ہیں، لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں، کسی کو بد دعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے تجھے مولا بیاہ لے جائے۔ سنتے ہو مولے؟"

لیکن مولا، تو جس بھٹی میں کودا تھا اس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا" ابے جا ناجے، اپنا کام کر، گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے پتھے۔ تیرا جی چھوٹ گیا ہے تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے، جا اپنا کام کر، میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی، ــــــ جا" اس نے لاٹھی کو گنگروں پہ بجایا اور

گلی کے سامنے والے مکان میں میراسی کو ہانک لگائی: "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا اُلّو کے پٹھے! جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا کیا! چلم لا۔"

تاجا پلٹ گیا، مگر گلی کے موڑ پہ جا کر رُک گیا اور مڑ کر مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جوانمرگی پہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور ڈنڈے کو اپنے پیچھے گھسیٹتا تاجے کے پاس آ کر بولا "دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے، اس لئے کہ کسی زمانے میں تیری میری یاری تھی۔ پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے تاجے! تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر ایسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چُک جائے، میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں تک پہنچے گا۔ اس لئے جا اپنا کام کر۔ تیری میری یاری ختم، اس لئے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پہ ترس کھائے تو آنچ میرے گنڈاسے تک جا پہنچتی ہے ــــ جا۔"

واپس آ کر اس نے میراسی سے چلم لے کر کش لگایا تو سُلفہ ابھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پہ گری اور ایک لمحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراسی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراسی بل کھا کر رہ گیا اور ہاتھ کو رانوں اور پنڈلیوں میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا "ترس کھاتا ہے حرامزادہ!"

اس نے چلم اٹھا کر سامنے دیوار پہ پٹخ دی اور ڈنڈا اٹھا کر ایک طرف

چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے، عورتیں سر پہ گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں اس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پہ بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی لانبی سرخ مرچوں کو چن رہی ہے جو چھلکتے ہوئے اس کے سر پہ رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آ گیا۔ لٹھ کو لانگنا تو ایک طرف رہا۔ اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے، اور جب مولا نے کڑک کر کہا "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پہ ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا "کوئی سڑی لگتے ہو!"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی "اسی لئے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پہ نہیں دے ماری۔ ایسے گٹے کٹے سے لگتے تھے تم۔ مجھے تو تم پر ترس آ گیا تھا۔"

"ترس آ گیا تھا تمہیں؟ مجھ پر؟ مولا پر؟" مولا دہاڑا۔

"مولا؟" لڑکی نے گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، اور ذرا سی چونک گئی۔

"ہاں، مولا، گنڈاسے والا۔" مولا نے بڑے ٹھسے سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سی مسکرا کے گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی، مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا "آجاؤ ماسی، آجاؤ، میں نہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔"

حواس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی "کیسا جھوٹ بکتے ہیں لوگ، کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے پر تو نے میرے لیے اپنی لٹھ ـــ"

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا

"سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے، ابھی ابھی کنوئیں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش ـــ"

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی، وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر اُسے وہی لڑکی جاتی نظر آئی، وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آگئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے، مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے ہی کا پیش خیمہ سمجھا گیا، لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سن لی، پلٹی اور پھر وہیں جمی کھڑی

رہ گئی۔ اس نے بس اتنا کیا کہ گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ چند بیریاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

"بس تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" مولا پکارا "کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔"

لڑکی بولی "میں ڈر کے نہیں رکی۔ ڈریں میرے دشمن۔"

مولا رک گیا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا: "بس اتنا بتا دو تم ہو کون —— کون ہو تم؟"

لڑکی ذرا سا مسکرا دی،

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی "یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے گامے کی منگیتر راجو ہے مولا بخش۔"

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹیک تک گیا اور پھر رستے کی طرف لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا "ٹھہرو راجو۔ یہ اپنی بیریاں لیتی جاؤ۔"

راجو رک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک بیری چن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انہیں راجو کی گٹھری میں ٹھونستے ہوئے بولا "تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے رستے پر ہو لی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں

رکھی رہ گئی مولابخش!" ـــــ

مولا پٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا "ماسی! یہ لڑکی راجو یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا"

"یہیں کی ہے بھی بیٹا اور نہیں بھی" بڑھیا بولی "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کہ کوئی دو ڈھائی کوس دور ایک ڈھوک بنالی، وہیں راجو اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے، تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے جاتی ہے اور بس"۔

مولا جواب میں صرف 'ہوں' کہہ کر واپس چلا گیا۔ لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا نام بھی ایک دو بار آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا، اور راجو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی!

اس واقعہ کے بعد مولا گلیوں میں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں یا چراگاہوں میں پھیرا کر کے واپس آجاتا۔ ماں اس کے رویہ پر چونکی مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں، وہ بھی جو بہا دیئے گئے اور وہ بھی جو بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں

سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پُر اسرار معلوم ہو رہی تھیں، مولا کی ماں بھی چولہا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً لٹھ پر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آ رہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔

وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں سے ہنکائے لئے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انہیں ٹوکا اور جواب میں انہوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے، یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے، چودھری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اُف تک نہ کرے!

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چودھری مظفر خود بنفس نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے، کڑک کر بولا "یہ چوری کا مال میرے گاؤں میں سے نہیں گزرے گا، چاہے یہ چودھری مظفر کا ہو چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو!"

اس نے لٹھ کو جھکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا۔ "جاؤ"

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا۔

"جا کر کہہ دو اپنے چودھری سے کہ مولے گنڈاسے والے نے تمہیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے

توچپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا کہ یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں، ان کے مالک پرسوں تک آنکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزت میری عزت ہے ماں!"

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے، یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافتیں طے کر کے کھوجیوں کی ناز برداریاں کرتے یہاں تک پہنچے تھے اور یہ سوچتے آرہے تھے کہ اگر ان کا مال چودھری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا، اور جب مولا ان کا مال ان کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں باہر گلی میں جمع ہو گیا تھا اور اس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور پھر منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا "آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو۔"

"کیوں؟" اس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ "میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور نرسوں بھی۔ نرسوں تھوم پیاز خریدنے آئی، پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی، کل ویسے ہی آگئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔"

"کل ویسے ہی کیوں آگئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی، بس جو چاہا آ گئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں؟"

"ویسے ہی ___" مولا نے بجھ کر کہا، پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا۔ "یہ گھی بیچ دی؟"

"ہاں بیچنا تو ہے پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔"

"کیوں؟"

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کُھل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لئے مڑی تو مولا ایک دم بولا "دیکھو راجو۔ میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی، اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا۔ پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے۔ میرے ہاتھ نہ بیچو میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔"

راجو کچھ سوچ کر بولی "چلو ——— آؤ۔"

مولا آگے آگے چلنے لگا، جاتے جاتے اسے وہم سا گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پٹوں کو گھورے جا رہی ہے، ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آ رہی تھی، وہ فوراً بولا "یہ چوزے میرے ہیں۔"

"ہوں گے" راجو بولی

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا۔ بولا "ماں، یہ سب گھی خرید لو میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔"

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تا کہ بڑھیا گھی سونگھ

ے گرد ہ تو اندر چلی گئی تھی ترازو دینے، اور مولانے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کر لیں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو، اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے، جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں، اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے، مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یونہیں چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا۔

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی "پہلے دیکھ لے ماسی۔ رگڑ کر سونگھ لے، آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر تو سونگھ لے پہلے!"

"نہ بیٹی ہیں تو نہ سونگھوں گی" ماں نے کہا "میرا تو روزہ مکروہ ہوتا ہے!" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

"تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں"

"تو پھر جا" ماں نے ترازو اٹھا کر ایک طرف پٹخ دی "تجھے حوصلہ کیسے ہوا!

میرے یہاں قدم دھرنے کا۔ رشتہ تنلوں کا اور سودے گھی کے! جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی "جن پر گنڈاسے چلانے ہیں اُن سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان۔ یہ گلے کی منگیتر ہے گلے کی۔ رنگے کے بیٹے کی!"

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا تھا جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اٹھی اور بولی: "تمہارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے۔"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اُسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مولا بولا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

ماں چکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا۔ نورے نے وہاں چائے کی دکان کھول رکھی تھی۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیور سے شہروں کی خبریں پوچھتے، اور مولا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ لوگ اب مولا کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے پاس سے حقہ تک

اٹھا لاتے تھے مگر کسی کو اس کی لٹھ کو چھونے یا الانگنے کی جرأت نہ ہوئی جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے اڈے پر لاری آکر رکی اور اس میں سے مسافر اترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر اُلّو بول گیا۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گلا اترا۔ اس کے پیچھے چار بڑے قد آور گبرو اترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے۔

مولا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے تیزی سے چارپائی پر سے پاؤں لٹکائے اور ٹینک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا "حقہ لانا نورے" وہ پکارا اور زرد رو نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقہ رکھ کر غڑاپ سے دکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نو وارد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اڑا دیا۔

"مولے!" گلے نے اسے للکارا۔

"کہو" مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلے کی طرف اڑا دیا

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں"

"کہو کہو"

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو، ہم بھی خالی ہاتھ ہیں۔"

"لو" مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم دیوار سے جیسے چمٹ کر رہ گیا۔ بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آووں پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلے سے پوچھا۔

گلا جو اب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا۔ "تم نے چودھری مظفر کا مال روکا تھا؟"

"ہاں" مولا نے بڑے اطمینان سے کہا "پھر؟"

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا۔ "چودھری نے تمہیں اس کام کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمہارے حوالے کر دیں"۔

"انعام!" مولا چونکا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے منہ پر مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ بات ہے!"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھا لی، ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نو وارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے مگر گلا لاری کی پہلی طرف کنکروں پر پھسل کر گر گیا۔ لپکتا ہوا مولا رک گیا۔ اٹھا ہوا

گنڈاسا جھکا اور جس زاویہ پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا۔

دم بخود ہجوم دیوار سے اچیٹ اچیٹ کر آگے آرہا تھا، بچے آدے کی راکھ اڑاتے ہوئے بھاگتے ہوئے اتر آئے، نورا دکان میں سے باہر آگیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے سینہ میں اتر جانا چاہتا ہے؛

اور پھر مولا جو معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لئے سکتے میں آگیا ہے؛ ایک قدم آگے بڑھا۔ لٹھ کو دور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دیا اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔" چودھری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے، رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔"

اس نے ہولے ہولے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا" رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمہیں تو دولہا بننا ہے ابھی ——— اس لئے جاؤ، اپنا کام کرو۔"

گلا سر جھکائے ہوئے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا، جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے، اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آدے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آکر نہایت وحشت سے بولنے لگی "تجھے گلے نے ٹھیڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے! ارے تو تو میرا اچھا بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا، تو نے ——— !" وہ اپنا سر پیٹتی

ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی
"تو تو رو رہا ہے مولے ؟"

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

چور

رحمان کا باپ جنگ میں مارا گیا، اور ماں امن میں ماری گئی جس کا نسخہ مغربی مدبروں نے ایشیائی مزاج کے لئے خاص طور سے تجویز کر رکھا تھا، باپ رنگون اور امپھال کے درمیان ایک جاپانی بم کی زد میں آ کر بکھر گیا - اور اماں گاؤں اور ہسپتال کے درمیان چلتے چلتے دم توڑ بیٹھی۔ ہسپتال والے کہتے تھے کہ اس کے پیٹ میں درد شدید ہو جائے گا تو جبھی وہ ہسپتال میں داخلے کی حق دار ہو سکے گی، ایک دن خوش قسمتی سے شدید درد اٹھا، تو وہ رحمان کو ساتھ لے کر ہسپتال کی طرف بھاگی مگر راستے ہی میں گر کر لوٹنے اور چیخنے لگی، اور مرنے سے پہلے رحمان کا ایک ہاتھ اس زور سے مروڑ ڈالا کہ رحمان مارے غصے کے "اماں کماں ٹھماں" کہہ کر پیچھے ہٹ گیا، اور رونے لگا۔

وہ ایک برس تک یونہی روتا رہا، اس کے قریبی رشتہ داروں میں صرف ایک پھوپھی زندہ تھی جو پردیس میں بیاہی گئی تھی، وہ اپنی بھابھی سے

پُرسے کے لئے گاؤں آئی اور واپس جاتے ہوئے اپنے بھائی کی نشانی کو ساتھ لیتی گئی، رحمان کے پھوپھا نے اپنے گاؤں میں کپڑے اور چمڑے کی دکان کھول رکھی تھی وہ روز بروز امیر ہو رہا تھا، اور شاید اسی لئے خسیس بھی ہو رہا تھا۔ چند روز بیوی سے کہتا رہا کہ "رحمان کو ایک روٹی سے زیادہ کھانا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کل سات آٹھ سال کا تو لونڈا ہے، اور ندیدہ اتنا کہ روٹیوں کا ٹوکرا بھی بھر کر رکھو تو آن کی آن میں جھاڑ پھیر دے، اس سے کہہ دو کہ ایسے ہی رہے ورنہ اپنے گاؤں کی راہ لے، میں دن بھر دکان میں بیٹھا تمہارے بھتیجے کے لئے سر نہیں پھوڑتا رہتا، کبھی میری بھی اولاد ہوگی پیر دستگیر محبوب سبحانی کی برکت سے"۔ —— رحمان نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس روز وہ دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں چھپا روتا رہا، شام کو بھوک لگی تو پھوپھی کے پاس یوں سمٹتا ہوا آیا جیسے اب تک وہ اس کی روٹیاں چرا چرا کر کھاتا رہا ہے۔ پھوپھی نے اس کے بالوں سے بھوسے کے تنکے چنے، پیار کیا اور اسے نصیحت کی کہ وہ ایک روٹی سے زیادہ کھانا نہ کھایا کرے۔ ورنہ اس کا ہاضمہ بگڑ جائے گا اور وہ مر جائے گا، نصیحت کرنے کے بعد جب اس نے ایک بار پھر رحمان کے ماتھے پر پیار کیا تو رحمان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پھوپھی کے ہونٹ تینچی کے پھل ہیں، وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پھوپھی نے اسے تسلیاں دیں مگر وہ یوں روئے جا رہا تھا جیسے پھوپھی کی ہر تسلی اس کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے گالی بن جاتی ہے۔ اس وقت اوپر سے پھوپھا آ گیا۔ اور جب بیوی سے سنا سے بتایا کہ رحمان دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں پڑا اپنی ماں کی یاد میں روتا رہا ہے،

تو بھوپھا کی آنکھوں میں خون اتر آیا "ساٹھ ستر روپے کے بھوسے کا ناس مار دیا ہوگا لونڈے نے۔ میں حیران ہوں یہ تم شیشے کے گھر میں بندر کیوں پال رہی ہو۔ دیکھو رحمو، اگر تم نے پھر کبھی بھوسے کی کوٹھری میں قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہے، سمجھے؟" —— رحمان نے ڈر کر ایک ہی روٹی پہ اکتفا کر لی اور بھوسے کی کوٹھری کی طرف بھولے سے بھی نہ دیکھا، لیکن ایک دن جب وہ شام کو ایک روٹی لینے کے لئے پھوپھی کے پاس آیا تو پھوپھا نے کڑک کر کہا "پوچھ لو اس حرامزادے سے۔"

رحمان کو اس کی ماں نے بتایا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی دینے والے کی زبان پہ پھوڑا نکل آتا ہے، اور جو گالی سن کر بدلہ نہ لے اس کے لمبی سی دم نکل آتی ہے، اور بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گالی دینے والے کا منہ نوچ لو، ڈھیلا کھینچ مارو، لاٹھی چلا دو، بے شک جان سے مار دو پر گالی کا جواب گالی میں نہ دو۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ چولھے میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر پھوپھا کے جبڑے پہ دے مارے، مگر اس وقت اس کی پھوپھی اٹھی اور اس کے پاس آ کر بڑے پیار سے بولی "سچ سچ بتا دو بیٹے، کہاں رکھے ہیں؟"

"کیا؟" رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور پھوپھا گرجا "تیری ماں کے خصم!"

"روپے میرے بچے، روپے" اس کی پھوپھی فوراً بولی۔ "سچ سچ بتا دو تو میں تمہیں ان میں سے ایک روپیہ دے دوں گی، کہاں رکھے ہیں؟ بھوسے کی کوٹھری میں تو نہیں کہیں؟"

رحمان کچھ کہنے کے لئے اپنے چھٹے ہوئے خشک ہونٹ ابھی کھول ہی رہا تھا کہ اس کا پھوپھا چارپائی پر سے اٹھا اور بیوی کو ہاتھ کے جھٹکے سے دھکیل دیا۔ بولا گھی مکھن لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ سن بے لونڈے، تو نے میری واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے زیادہ نہ کم پورے پندرہ روپے نکالے ہیں۔ وہ سیدھی طرح یہاں میرے ہاتھ پر رکھ دے ورنہ یہیں بیٹھ کر تیرا قیمہ بنا ڈالوں گا۔ بتا" اس نے رحمان کو تھپڑ مارنے کے لئے ایک ہاتھ تان لیا۔

رحمان بگولے میں پھنسا ہوا کاغذ کا پرزہ ہو رہا تھا، پلکیں یوں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں میں مٹی گھس گئی ہے، ہونٹ کھلے تھے، میلے میلے گلابی رنگ میں سے گلاب غائب ہو گیا تھا، صرف میل باقی رہ گیا تھا، بس اتنا کہہ سکا "کون سی واسکٹ؟" اور پھر ایک دم اس کی اجڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو پھیل گئے، اس کا نیچے والا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا، ٹھوڑی میں چند شکنیں پیدا ہوئیں، نتھنے پھڑکے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کون سی واسکٹ!" پھوپھا یوں آگے بڑھا جیسے اسے روند کر نکل جائے گا۔ "ابے وہی سیپ کے بٹنوں والی اور کونسی!"

اور رحمان نے پھوپھی کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بہت اونچی آواز میں فریاد کی "مجھے خدا کی قسم، نبی جی کی قسم، مجھے پیر دستگیر کی قسم پھوپھی۔ میں نے واسکٹ کو چھوا بھی ہو تو میرے ہاتھ ——"

مگر پھوپھی لپک کر آئی اور اپنے شوہر سے بولی "سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ کہاں رکھی ہے؟ میں نے تو وہ کالی ہُوف والی واسکٹ دیکھی تھی۔"

پھر رحمان کو تنہا چھوڑ کر دونوں اندر بھاگے، ذرا سی دیر کے بعد پلٹے تو پھوپھی کہہ رہی تھی "خواہ مخواہ میرے بچے پر تہمت لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ اپنے روپے ایک بار پھر گن لو، ہمارے خاندان نے قتل کئے ہیں، پر چوری کبھی نہیں کی، ہاں - ایک روپیہ ادھر لاؤ - یہ میرے بچے کا انعام ہے، خواہ مخواہ رلا دیا بے چارے کو - بے کے کھانا حرام کر ڈالا - ادھر لاؤ روپیہ!"

رحمان ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہتے جا رہے تھے، لیکن اس کی سسکیاں اور ہچکیاں تھم گئی تھیں -

پھوپھی نے شوہر سے ایک روپیہ چھین لیا اور رحمان کی طرف بڑھی، پھوپھا بولا "آج نہیں تو کل چرا لے گا - ندیدہ تو ہے ہی، یتیم لڑکا تو ندیدہ ہوتا ہی ہے، چاہے کسی ملک کے لاٹ صاحب کا لڑکا ہو!"

پھوپھی نے رحمان کے پاس آکر اسے اکٹھے بہت سے پیار کر ڈالے، پھر اس کی مٹھی کھول کر اس میں روپیہ رکھا اور اس کی انگلیوں کو بند کر کے اس کی بلائیں لیں، دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑ کر اسے کوٹھے میں لے آئی، مجبور کر کے کھانا کھلایا - اور جب وہ دوسری روٹی میں سے ایک نوالہ توڑنے لگی تو رحمان پہلی بار بولا "نہیں پھوپھی، بس"-

"کیوں؟" پھوپھی نے پیار بھرے غصے میں پوچھا-

"ہاضمہ بگڑ جائے گا" رحمان بولا -

پھوپھی یکایک رو دی اور چہرے کو گھٹنوں میں چھپا لیا -

رحمان باہر نکلا تو پھوپھا چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا - وہ اس کے پاس آیا

اور روپیہ اس کی ران پر رکھ کر بولا "یہ میں نہیں لیتا!"

"نہ لے" پھوپھا نے روپیہ اٹھا لیا۔

"ہاں بس نہیں لیتا" رحمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پلٹ کر صحن سے باہر چلا گیا۔

وہ اس صحن میں پھر کبھی داخل نہ ہوا، کیونکہ وہ رات کی رات گاؤں سے نکلا اور کہیں ٹوٹتی رات کو ایک کھیت کی منڈیر پر جاکر ذرا سا ستایا۔ اور پھر وہیں سوگیا۔ صبح کو وہ اٹھا تو کھیتوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور قریب ہی ایک درخت کے ٹھنٹھ پر ایک کوّا بیٹھا چیخ رہا تھا۔ رحمان پہلے تو حواس باختہ بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر رونے لگا، اور روتے روتے "اماں، اماں" پکارنے لگا، کافی دیر تک رونے کے بعد اس نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "اماں کماں ٹھماں!" وہ اٹھا۔ آنسو پونچھے، اور کسانوں سے اپنے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہوا شام سے پہلے گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا۔ تو یوں بے اختیار رونے لگا جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہے، لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ اسے دلاسا دیتے، ٹھٹکتے اور ٹنگ آکر آگے نکل جاتے، اس کے گرد بہت سے لڑکے جمع ہو گئے جو اسے بڑی ہمدردی سے دیکھتے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے "بے چارے کی ماں مر گئی تھی نا پچھلے سال!" ـــــ "ماں تو میری بھی مر گئی ہے پر میں تو یوں نہیں روتا" ـــــ "تمہارا باپ تو ہے نا یار۔ اس کا تو باپ بھی نہیں" ـــــ "ہاں ہاں، اس بے چارے کا تو باپ بھی نہیں نا" ـــــ اور وہ پھر ہمدردی سے رحمان کو دیکھنے لگتے جواب زور زور سے ہچکیاں لینے لگا تھا اور آنسو پونچھتے پونچھتے اس کے

گالوں کی جلد چھل گئی تھی، شام کو اس کے پاس راجہ اللہ نواز کا سائیس آیا۔ اور اسے بڑے پیار سے بتایا کہ راجہ اللہ نواز نے اسے اپنے پاس بلایا ہے۔

راجہ اللہ نواز گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا بزرگ تھا، زمینیں بھی خاصی تھیں، طب میں بھی کچھ درک حاصل تھا اور مفت علاج کرنے کی وجہ سے وہ مرجع عوام ہو گیا تھا، دردِ شقیقہ، دردِ طحال، اور دردِ دنداں کو دور کرنے کے لئے اس کے پاس تیر بہدف تعویذ اور دم تھے، پھر وہ بلا کا تہجد گذار تھا اور روزانہ سینکڑوں نوافل پڑھنے میں تو وہ یکتائے روزگار سمجھا جاتا تھا، اس کے اصطبل میں دو گھوڑے برسوں سے موجود تھے، گھر کے لئے سودا سلف خود خرید لاتا تھا لیکن ان گھوڑوں سے اسے اتنی محبت تھی کہ ان کے لئے کم از کم دو خدمت گار تو ہمیشہ موجود رہے، رحمان جب راجہ اللہ نواز کے پاس آیا تو اس وقت نمازی شام کو نماز پڑھ کر اس کی بیٹھک میں جمع ہو گئے تھے، سب کے سامنے اس نے رحمان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولا " دیکھو بیٹا تم یتیم ہو، یوں پھوٹ پھوٹ کر روؤ گے تو مجھے ڈر ہے کہ خداوند تعالےٰ اس گاؤں کو غرق ہی نہ کر دے، تمہارا باپ مرا تو اس میں گاؤں والوں کا کوئی قصور نہیں تھا، تمہاری ماں چل بسی تو یہ بھی اس کی قسمت کا لکھا تھا۔ یہ سب کام خداوند تعالےٰ کے ہیں جو بڑا بے نیاز اور بے پروا ہے، اس لئے خدا کے لئے اتنا نہ روؤ کہ تمہارا صبر اس بے قصور گاؤں پر ٹوٹے۔

میں سارے گاؤں کی طرف سے تمہارے آنسو پونچھنے کو تیار ہوں، یوں کرو کہ یہیں میرے اصطبل میں رہو، تمہاری نوکری یہ ہے کہ گھوڑوں کے تھان صاف رہیں، ادھر گھوڑے نے لید کریں تو ادھر تم پھاوڑے سے اصطبل کو آئینہ بنا دو، اس

نوکری کے بدلے میں ہر روز شام کا کھانا تم میرے گھر سے کھانا، سمجھے؟ اوپر سے سال میں ایک دو بار تمہیں میرے بچوں کی اترن بھی ملتی رہے گی، سو میں تمہیں انشا اللہ تعالٰے ننگا بھی نہیں رہنے دوں گا۔ باقی رہا صبح کا کھانا۔ تو اس کا انتظام یوں ہو جائے گا، کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں، ان کے ہاں کا کوڑا اٹھا کر باہر گھورے پر پھینک آیا کرو اور بس۔ سب پردہ نشین بیبیاں ہیں، نائن میراثن آئے تو کوڑا اٹھے، تمہاری وجہ سے یہ فائدہ ہو گا کہ گھر صاف رہیں گے، بس۔ اتنا سا کام ہے، تم اس گاؤں کے بیٹے ہو، اور تمہارے سر پہ ہاتھ رکھنا میرا فرض ہے، کیوں بھئی، کیا غلط کہا ہے میں نے؟"

نمازی تو اس دوران میں راجہ اللہ نواز کی سخاوت سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ بعض رقیق القلب لوگوں پر رقت تک چھا گئی، ایک نے راجہ اللہ نواز کو داتا اللہ نواز کہ ڈالا، رحمان کو ایک شخص ایک طرف لے گیا، راجہ اللہ نواز کے گھر سے کھانا آیا تھا جس میں دو روٹیاں تھیں اور ان پر خود رحمان کی مٹھی سے بھی چھوٹی پیاز کی دو گانٹھیں اس نے آناً فاناً روٹیوں کا صفایا کر دیا اور پھر بیٹھک میں جا کر راجہ اللہ نواز سے کہا "جی میں نے روٹی کھالی ہے۔"

راجہ اللہ نواز بولا "بہت اچھا کیا۔"

رحمان نے بڑی معصومیت سے کہا "جی میری نوکری ابھی سے لگ گئی کہ صبح لگے گی؟"

راجہ اللہ نواز اور دوسرے نمازی ہنسنے لگے، راجہ بولا "ابھی سے لگ گئی بیٹا۔"

اور رحمان نے اسی انداز میں کہا "تو جی پھر یہ بتا دیجیے کہ بھاوڑا کہاں رکھا ہے"

نمازی اور زور سے ہنسنے لگے مگر راجہ اللہ نواز سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے کندھے پر سے بڑا سا نیلا رومال اتارا اپنی آنکھیں پونچھ کر رحمان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "نہیں بیٹا، میں نے غلط کہا تھا۔ تمہاری نوکری صبح لگے گی۔"

مگر رحمان کی منطق کا سلسلہ جاری تھا۔ فوراً بولا "پر کھانا تو مجھے ابھی سے ملنے لگا ہے جی۔"

راجہ اللہ نواز کے ہونٹ اس کی داڑھی اور مونچھوں میں سے لٹک آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔ "اسے لے جاؤ" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "اس بچے کو لے جا کر سلا دو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ابھی بھونچال آئے گا اور ہم سب دھرتی کے پیٹ میں اتر جائیں گے، اور یہ حرام موت ہو گی، لے جاؤ اسے — جاؤ بیٹا، جاؤ، کلمہ پڑھ کر آرام سے سو جاؤ، بڑوں سے بہت ذلیل بازی نہیں کرتے خداوند تعالےٰ خفا ہو جاتا ہے۔"

اور رحمان نے سوچا کہ خداوند تعالےٰ اس سے خوش ہی کب تھا جو اب خفا ہو گا! اور جانے خداوند تعالےٰ یوں ہی بے بات کی بات پر بچوں کی طرح کیوں خفا ہو جاتا ہے، آخر رحمان نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی، اس نے تو زندگی میں صرف ایک بار چوری کی تھی، اور وہ بھی ایک آنے کی پنسل کی، پھر جب استاد نے اس کی پانچ انگلیوں کے درمیان چار پنسلیں رکھ کر ان انگلیوں کو دبایا تھا تو اس نے چیخ کر سچ بول دیا تھا۔

"میری نہیں، غلام یسین کی ہے!" پھر اس نے تو ماں تک کو ساری بات سچ سچ بتا دی تھی، اور ماں نے کہا تھا کہ اگر رحمان نے پھر کبھی چوری کی تو وہ اسے تبیس دھاریں نہیں بخشے گی، اور جس بچے کو اس کی ماں تبیس دھاریں نہ بخشے وہ ساری عمر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، اس کے بعد آج تک اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی، لیکن وہ لوگوں کی ٹھوکریں تو اب تک کھا رہا تھا۔ تو کیا ماں نے مرنے سے پہلے اسے تبیس دھاریں نہیں بخشی تھیں " اماں! کہاں! کہاں!" وہ غصے میں پکار اٹھا۔ اور پھر رونے لگا۔ اور یونہی روتے روتے سو گیا۔

صبح کو اصطبل میں پھاوڑے سے لید جمع کرتے ہوئے اسے ماں یاد آگئی، ایک بار کوٹھے کو لیپنے کے لئے جب وہ گارا بنانا چاہتی تھی تو اسے گارے کو گاڑھا کرنے کے لئے اس میں گھوڑے کی لید ملانے کا خیال سوجھا۔ ٹوکرا سر پر رکھ کر وہ سارے گاؤں میں گھوم آئی تھی مگر اسے کہیں سے لید نہ ملی تھی۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا تھا کہ آج وہ بھی گارا بنا رہے ہیں، بعض سگھڑ گھرانے تو لید کو خشک کر کے اس سے ایندھن کا کام لیتے تھے ——— اور آج رحمان کے پاس ٹوکروں لید جمع رکھی ہے مگر ماں نہیں جو گارا بنا سکے، فوراً اس کے ذہن پر اپنا کوٹھا ابھرا اور وہ پھاوڑا پھینک کر گلی میں بھاگنے لگا۔ جب وہ اپنے اس کوٹھے کے سامنے پہنچا جس میں اس نے زندگی کے سات برس گذارے تھے، تو یہ دیکھ کر اس کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی کہ کوٹھے کی چھت گر چکی ہے، اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر دو بلیاں آمنے سامنے بیٹھی دُمیں پھلائے غرّا رہی ہیں، ایک پتھر اٹھا کر اس نے بلیوں کی طرف پھینکا

اور چلایا۔ "ہٹ جاؤ حرامزادیو، سؤر کی بچیو، اُلّو کی پٹھیو!" —— بلیاں بھاگ گئیں مگر اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس کی زبان میں جلن ہو رہی ہے اور زبان کی نوک پر ایک پھوڑا نکل رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر کسی طرح دونوں بلیوں کو پکڑ لائے اور انہیں دیوار پر بٹھا کر ان سے بڑے پیار سے کہے کہ "غزاؤ، شوق سے غزاؤ، اور مجھے معاف کر دو۔" اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ماں سامنے دیوار سے لگی کھڑی ہے اور اسے بڑے غصے سے گھور رہی ہے، وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا، اور جب راجہ اللہ نواز کا سائیس اسے بیٹھک میں لے آیا تو راجہ اللہ نواز وظائف پڑھ رہا تھا، اس نے اپنا گریباں اٹھا کر اس میں چھو کی، اور بولا "رو کیوں رہے ہو بیٹا؟" تو رحمان نے پھر سے روتے ہوئے کہا۔ "جی آج میں نے گالی بکی ہے، اور ماں کہتی تھی جو گالی بکے گا اس کی زبان میں پھوڑا نکل آئے گا۔" راجہ بولا "ٹھیک ہی تو ہے" اور پھر رحمان کو پاس بلایا۔ اس کا منہ کھول کر اس میں چھُو کی اور کہا۔ "اب پھوڑا ووڑا نہیں نکلے گا لیکن تم نے گالی دی کسے؟" رحمان معصومیت سے بولا "جی دو بلیوں کو!" —— اور راجہ اللہ نواز یوں بے اختیار ہو کر ہنسا کہ رحمان تک کو ہنسی آ گئی، اور وہ اصطبل میں جا کر پیا وڑے سے کھیلنے لگا۔

آہستہ آہستہ وہ اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ وہ صبح کو راجہ اللہ نواز کے ہاں جا کر چھاچھ کا ایک پیالہ پیتا اور پھر اس کے گھر کا کوڑا ایک ٹوکرے میں بھر کر گلی کے نکڑ پر ایک گھورے پر پھینک آتا، راجہ کے خاندان میں سات

گھرتھے، کوڑے کے یہ سات ٹوکرے ڈھونے کے بعد وہ اصطبل میں آتا اور پھاوڑا سنبھال لیتا، گھوڑے کے تھانوں پر ریت پھیلاتا تاکہ کیچڑ نہ ہونے پائے اور پھر ایک خالی ناند کا سہارا لے کر اوپر چھت کو گھورتا رہتا، جس میں عموماً بھڑیں اڑتی رہتی تھیں، جب کوئی بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی تو بھڑ اور مکڑی کی آپس میں خوب لڑائی ہوتی، مکڑی بھڑ کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھتی تو بھڑ کالا سا ڈنک نکال کر مدافعت کرتی، اور مکڑی جالے کے پرلے سرے تک بھاگ جاتی - پھر جب کبھی دو بھڑیں آپس میں گتھ کر نیچے گرتیں تو وہ ایک بھڑ کو سر کی طرف سے پکڑ کر اس کا ڈنک نوچ لیتا اور اس کی ٹانگ میں دھاگا باندھ کر اسے اڑانے کے لئے چھوڑ دیتا اور خوب خوب ہنستا، پھر ایک دم اسے پھاوڑا استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اپنے کام میں جُٹ جاتا، اب ماں بھی اسے بہت کم یاد آتی تھی، اور یاد بھی آتی تھی تو رحمان کی آنکھیں نہیں ڈبڈباتی تھیں، وہ بس ذرا سا اداس ہو جاتا، تب اوپر چھت میں بھڑ اور مکڑی کی جنگ شروع ہو جاتی اور وہ خالی الذہن ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگتا۔

گرمیوں میں کوڑے کے ٹوکروں کا بوجھ اچانک بڑھ گیا، راجہ اللہ نواز کے خاندان میں منوں خربوزے کھائے جانے لگے، اور ان کے موٹے موٹے چھلکوں سے ٹوکرے اٹ اٹ گئے، کئی بار اسے ایک ایک گھر کا کوڑا دو دو بار لے جانا پڑتا اور جب وہ چھلکوں کو گھورے پر پھینکتا تو اسے ان پر دانتوں کے نشان نظر آتے اور اس کے دانتوں میں چل سی ہونے لگتی، کئی چھلکوں پر

تربوز کا گلابی گودا باقی رہ جاتا تھا اور ان چھلکوں کو گندگی کے ڈھیر پر پھینکتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جنہیں تربوز کھانے کا سلیقہ تک نہیں آتا۔ اور ایک میری ماں تھی کہ گودے کو چھری سے یوں کاٹتی تھی کہ چھلکے پر گلابی رنگ کا ایک ذرہ تک کہیں باقی نہ رہے، اور ایک یہ راجے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان کے گھروں میں سے ساری چھریاں چوری ہو گئیں، پھر اس کے منہ میں آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے کے تربوزوں کا ذائقہ پانی بن کر امڈ آتا، اور اس کا کیسا کیسا جی چاہتا کہ چھلکوں پر سے بچے کھچے گلابی رنگ چاٹ لے، لیکن وہ ہمیشہ اس گندے ارادے پر قابو پا لیتا، ویسے ٹوکرے کو گھورے پر الٹ کر چھلکوں کو کرید کرید کر دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی، اب تربوزوں کے ساتھ خربوزوں کے چھلکے بھی شامل ہونے لگے تھے، اور راجہ اللہ نواز کے ہاں کی گندگی میں تو اسے ایک دن آموں کی گٹھلیاں بھی نظر آ گئی تھیں، اس وقت رحمان کے پیٹ میں چھاچھ چھل چھل چھلکتی معلوم ہوئی، اور زبان کی جڑ میں آم کا ذائقہ جیسے چمٹ کر رہ گیا۔

ایک روز وہ ٹوکرا الٹ کر گندگی کو کرید رہا تھا جب اسے سلولائیڈ کا ایک بھلا چنگا گڈا انگریزی ٹوپی پہنے ہاتھ میں کالے رنگ کی چھتری لئے کوڑے میں لپٹا ہوا ملا، گڈے کو اپنے چولے سے جھاڑ پونچھ کر غور سے دیکھا تو اسے بے اختیار ہنسی آ گئی، گڈے کی ایک آنکھ سے پتلی غائب تھی، ایک ہاتھ میں خالی ٹوکرا لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں گڈا لئے وہ اصطبل کے پاس سے گزرا تو جی میں آئی کہ گڈے کو یہیں کہیں چھپا کر رکھ دے اور پھر دن بھر اس سے کھیلا کرے، کبھی اسے سر کے بل کھڑا کر دے، کبھی سلا دے اور کبھی ٹہلائے، مگر پھر

ایک دم اس کے کان گرم ہو گئے۔ اور گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ راجہ اللہ نواز کے ہاں جا کر لڈے کو اس کی بیوی کے سامنے رکھ دیا اور بولا "بی بی جی۔ یہ گڈا کوڑے میں چلا گیا تھا"۔ راجہ اللہ نواز بھی قریب ہی بیٹھا بادامول چائے کے ساتھ شہادت پڑھ رہا تھا۔ فوراً اٹھا اور بولا "شاباش بیٹا۔ تم نے چوری نہیں کی۔ تمہیں آج انعام ملے گا"۔ اندر جا کر وہ تربوز کی ایک پھانک اٹھا لایا۔ اور رحمان کے ہاتھوں پر رکھ دی۔

اصطبل میں آ کر وہ اس پھانک پر پل پڑا، اور چھلکے کی مٹی تک کو نوچ ڈالا، سخت چھلکے نے اس کا ذائقہ بگاڑ دیا اور اس نے سوچا "بہت بڑا راجہ بنا پھرتا ہے۔ انعام ہی دینا تھا تو وہ گڈا ہی دے دیتا۔ تربوز کی ایک پھانک بھی انعاموں میں کوئی انعام ہے، کبھی ایک چھوٹا سا تربوز ہی اٹھا کے دے دیتا، ذرا سا تربوز کا پانی تو پی لیتے، واہ!"

ایک روز بڑے زور کی بارش ہوئی اور دوسرے دن جب رحمان چلمچہ پہنچے کے لئے راجہ اللہ نواز کے ہاں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ گلیوں میں ہر طرف تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر لگے ہیں، اور لوگ ٹوکرے بھر بھر کے خریدے لئے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکے کی زبانی سے معلوم ہوا کہ بارش کے بعد تربوزوں اور خربوزوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ گل جاتے ہیں۔ اس لئے کسانوں نے کھیت کے کھیت صاف کر دیئے ہیں اور اب انہیں اونے پونے بیچ رہے ہیں۔ رحمان کو اچانک راجہ اللہ نواز پر غصہ آ گیا۔ نوکری لگتی ہے تو تنخواہیں ملتی ہیں، یہ بھی کیا کہ بس دن دن بھر اصطبل صاف کرو، سیروں گوبر کے ٹوکرے اٹھاؤ اور بدلے میں

دو دمڑیاں دریا دلی کی دو کا تصیں ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرو، کنجوس، مکھی چوس، مہینے میں ایک آنہ ہی دے دیتا تو ہم یہ جاتی بہار کا پھل تو ذرا سا چکھ لیتے،

بچے تنگ پیٹ اور سینے سے چار چار پانچ پانچ خربوزے لگائے بھاگے جا رہے تھے، وہ راجہ اللہ نواز کے ہاں سے چھاچھ پینے چلا تھا۔ ایک بچے کی گرفت ڈھیلی پڑھ گئی اور ایک خربوزہ گر کر دور لڑھک گیا۔ رحمان نے لپک کر خربوزہ اٹھایا اسے جھاڑا اور پھر یونہی ذرا سا سونگھ کر اسے بچے کے حوالے کر دیا۔ خربوزے کی خوشبو اس کی ناک سے چھٹی چلی آئی اور اس نے جی میں کہا۔ سو سو روپے شرطیہ خربوزہ کھانڈ کی طرح میٹھا ہوگا پھیکا نکلے تو ناک کٹوا ڈالوں؛

صحن میں جا کر اس نے گھڑول کے پیچھے سے اپنا پیالہ اٹھایا اور اسے دھو کر راجہ کی بیوی کے پاس آیا۔ چھاچھ پی کر وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس نے خوب پیٹ بھر کر تربوز اور خربوزے کھانے کے بعد اوپر سے چھاچھ پی لی ہے۔ اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح ہیضہ ہو جاتا ہے، پھر اس نے اپنی ناک کو مل ڈالا جس میں سے خربوزے کی بو کم بخت نکلتی ہی نہ تھی، اسے اپنے اس شبے پہ ہنسی آ گئی، اور وہ کوڑے کا ٹوکرا اٹھا کر باہر چلا گیا۔

گھورے پہ جا کر اس نے کوڑے کو کریدا۔ چھلکوں کے نیچے کوٹھوں کے فرش کی مٹی تھی، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے، راجہ اللہ نواز کے حقے کی جلی ہوئی تمباکو تھی اور ــــــ، رحمان سناٹے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے کوڑے کے نیچے اس نے بچھو دیکھ لیا ہے، پھر اس کے خشک ہونٹ ذرا سے پھڑکے اور وہ مسکرانے لگا، ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ایک پرزہ

اٹھا لیا — یہ ایک روپے کا نوٹ تھا!

نوٹ کو مٹھی میں بند کر کے اور ٹوکرے کو وہیں چھوڑ کر وہ بھاگا اور اصطبل کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنی مٹھی کچھ یوں کھولی جیسے نوٹ کے پر ہیں اور موقع پاتے ہی وہ پھر سے اڑ جائے گا۔ مٹھی کو ایک بار پھر سختی سے بند کر کے وہ لپکا اور گلی میں تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس جا کر رکا، گدھوں پر سے خربوزوں سے بھرے ہوئے بورے اتارے جا رہے تھے، اور ڈھیر اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ آنے جانے والے پرلی دیوار سے لگ لگ کر گزر رہے تھے،

ایک دم سے ایک ہی بار اکٹھے ایک روپے کے تربوز اور خربوزے خریدنے کے لئے اس نے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور کان گرم ہو گئے اور ادھر سے کسان بولا "اب یہاں کوئی مداری کا کھیل ہو رہا ہے؟ لینا ہے تو لے نہیں تو گھر کی راہ لے، لینا ہے کچھ؟"۔

رحمان پلٹ آیا۔ وہ سیدھا راجہ اللہ نواز کے پاس گیا، اور نوٹ کو اس کے سامنے رکھ کر بولا "جی یہ روپیہ کوڑے میں چلا گیا تھا!"

راجہ اللہ نواز چونکا اور اپنی بیوی کو ڈانٹا "کچھ سنا؟ اب روپے بھی کوڑے میں اٹھے جا رہے ہیں، تم نے گھر کی ایسی ہی خبر گیری کی تو کبھی میں بھی کوڑے میں اُٹھ جاؤں گا، رحمان نیک بچہ ہے بے چارہ۔ کوئی اور ہوتا تو یہ ایک روپیہ تو گیا تھا۔ ادھر آ، اسے کہیں سنبھال کے رکھ دے۔" پھر وہ رحمان سے مخاطب ہُوا۔ "جیو بیٹا جیو۔ خداوند تعالےٰ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ یہ تمہارے خاندان

کی شرافت ہے، تمہاری جگہ کوئی کمین ہوتا تو سر پر قرآن رکھ کر بھی انکار کر دیتا جیوے"
اس نے رحمان کے سر پر دھیرے سے ہاتھ پھیر دیا۔

"ٹوکرا کہاں چھوڑ آئے؟" راجہ اللہ نواز کی بیوی نے پوچھا۔ وہ لوٹ کو اندر بڑے کوٹھے میں ہمندوتوں کی قطار کے اوپر ایک کٹورے کے نیچے رکھ رہی تھی۔

"جی ٹوکرا؟" رحمان نے کہا۔ "جی ہاں۔ ٹوکرا" اس نے خود ہی جواب دیا، اور بھاگا، ٹوکرے کو گھورے پر پڑا دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اسے صحن میں اٹھا لایا۔

آج اس نے باقی چھ گھروں کے ٹوکرے گھورے پر الٹ دیئے مگر انہیں کریدا نہیں، وہ بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ قدموں میں سیسہ بھر گیا تھا۔ گھٹنوں میں ذرا سا بھی دم نہ تھا، خالی ٹوکرے کے بوجھ نے اس کا ایک کندھا جھکا رکھا تھا۔

کوڑا ڈھونے کے بعد وہ اصطبل میں آیا اور ناند کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ لید کی ڈھیریاں لگی تھیں مگر اس نے پھاوڑے کو پاؤں سے پرے دھکیل دیا اور آنکھیں بند کر لیں، کافی دیر کے بعد وہ اٹھا اور پاؤں گھسٹتا راجہ اللہ نواز کے صحن میں داخل ہوا۔ گھر کے سب لوگ پرلی طرف سائے میں کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ راجہ کی بیوی نے اسے دو روٹیوں پر پیاز کی دو گانٹھیں رکھ کر دیں، اور پھر بولی "ٹھہرو، پیازیں مجھے دے دو، آج میں تمہیں مرچوں کا اچار دوں گی۔" اس نے پیازیں اٹھا کر روٹیوں پر دو مرچیں رکھ دیں اور رحمان بڑے کوٹھے کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

اچانک اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی، وہ روٹی کو چبانے کے بجائے نگلنے

لگا، اور آن کی آن میں صفایا کر کے اٹھا، ذرا سا جھک کر پرلی طرف دیکھا۔ سارا گھرانا کھانے میں مصروف تھا، وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دبے پاؤں بڑے کوٹھے میں گیا۔ بلی کی طرح پلنگ پر چڑھا اور سب سے اوپر والے صندوق پر سے کٹورا اٹھا کر روپے کے نوٹ کو مٹھی میں بھینچ لیا، پلنگ پر سے اترا تو اس کے چہرے پر ہلدی کی سی زردی چھائی تھی، دروازے تک آیا تو دیکا یک بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور پلنگ کی چادر پر سے اپنے پاؤں کے نشانات کو جھاڑ دیا۔ باہر آ کر اس نے انکھیوں سے پرلی طرف دیکھا۔ سب کھانے میں مگن تھے، وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب صحن کے وسط میں آیا تو راجہ کی بیوی بولی: "رحمان!"

"ارے!" رحمان اچھل پڑا۔ سب ہنسنے لگے "کیا ہوا؟" بیوی نے پوچھا: "ڈر گیا بے چارہ، تمہاری آواز بھی تو ماشاءاللہ ہے،" راجہ بولا۔

"جی" رحمان نے کافی دیر کے بعد جواب دیا۔ اس کی آواز خود اس سے بھی پہچانی نہ گئی۔

"کھا چکے کھانا؟" بیوی نے پوچھا،

"جی" رحمان کی ڈھارس بندھی۔

"اچھا تھا؟" بیوی نے پھر پوچھا۔

"جی" رحمان نے کہا۔ پھر ہمت کر کے چند الفاظ بڑھائے "جی بڑا مزیدار تھا۔"

"اچھا" بیوی بولی،

رحمان باہر گلی میں آ گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے نوٹ کی بہت سی چونچیں نکل آئی ہیں، اور وہ ان سب چونچوں سے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں پر ٹھونگیں مارے جا رہا ہے۔ رحمان نے نوٹ کو دوسری مٹھی میں لے لیا اور پہلی مٹھی کے پسینے کو چولے پر رگڑ دیا۔ تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس پہنچتے ہی وہ مڑ آیا۔ اور اصطبل میں چلا گیا۔ ٹھیک ہے، اس نے سوچا۔ چوری کی جائے تو مائیں بتیس دھاریں نہیں بخشتیں۔ مگر جب ماں مر چکی ہو تو بتیس دھاروں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، رہا عمر بھر ٹھوکریں کھانے کا سوال تو اس سے زیادہ اور کیا ٹھوکریں کھاؤں گا۔ اور پھر ایک روپے کی چوری بھی کوئی چوری ہے، بڑے ہو کر راجہ کو پورا روپیہ ادا کر دوں گا، بھئی یہ تو ادھار ہے، کما کر اتار لوں گا۔ ایسی بھی کیا بات ہے،

مطمئن ہو کر وہ باہر آیا اور فیصلہ کیا کہ تربوز اور خربوزے اس گلی سے خریدنا حماقت ہے، کسی دور کی گلی میں چلتے ہیں، وہیں خریدیں گے، وہیں کھائیں گے اور پھر مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھو لیں گے، اللہ اللہ خیر سلا۔

وہ گلیاں طے کرتا ہوا تیز تیز جا رہا تھا، ایک گلی میں اسے گھڑے گھڑے کے برابر تربوز پڑے نظر آئے، وہ ان کی طرف بڑھا مگر ایک جگہ جا کر یوں ایکدم تھم گیا جیسے دلدل میں دھنس گیا ہے،

اس کی نظریں اپنے گھروندے پر جم گئیں جس کی چھت گر چکی تھی، اور جس کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پر پتیاں اڑتی تھیں، اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوٹھے کے کھنڈر میں سے اس کی ماں پیٹ کے درد سے کراہتی اور روتی ہوئی نکلی ہے، اور اس کے قریب آ کر اس نے رحمان کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ

مار دیا ہے!

یکایک وہ پوری شدت سے واپس بھاگا۔ اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہے، وہ گلیوں میں اڑا جا رہا تھا، وہ اصطبل کے پاس بھی نہیں رکا، راجہ اللہ نواز کی حویلی میں بھی وہ اسی طرح بھاگتا ہوا داخل ہوا اور کورنے سے ہانپتے ہوئے راجہ اللہ نواز کے پاس جا کر دھم سے گرا اور دو تین ڈھکنیاں کھا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کیا ہے؟ ارے کیا ہوا؟" سارا گھرانا اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔

رحمان نے بھنچی ہوئی مٹھی میں سے نوٹ نکالا اور راجہ اللہ نواز کے قدموں میں رکھ کر جیسے کہیں پاتال سے بولا۔ "جی میں نے آپ کا یہ روپیہ چرا لیا تھا۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تڑپ کر اٹھا، بھاگ کر صحن سے نکلا۔ اصطبل میں جا کر لید کی ڈھیریوں میں لوٹنے لگا اور بلبلا بلبلا کر کہنے لگا۔ "میں پھر چوری نہیں کروں گا۔ میں کبھی چوری نہیں کروں گا اماں!"

پھر اچانک اُٹھ کر اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں اور پوری قوت سے پکارا۔ "اماں۔ کماں۔ ٹھماں!" اور بلکتا ہوا ناند میں گر پڑا۔

نمونہ

نہیں نہیں، میں بیمار نہیں ہوں، یہ جو میرا رنگ ذرا اڑا اڑا سا لگ رہا ہے نا تو اس کی وجہ ایک واقعہ ہے جو ابھی ابھی ہوا ہے، اور ایک بات ہے جو میں ابھی تک سوچ رہا ہوں،

آج مس ڈورتھی سکوڈا کی سالگرہ ہے،

ہاں، یہی کوئی بیسویں یا بائیسویں سالگرہ ہو گی لیکن مجھے اس سے کیا، میں تو اب کچھ اور سوچ رہا ہوں،

یہ جو ابھی ابھی چاندی کے بہت سے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آئی تھی نہ یہ گھنگھرو یا گھنٹیاں نہیں بجی تھیں مس ڈورتھی سکوڈا ہنسی تھی، مس ڈورتھی سکوڈا ـــــ چلو تمہاری آسانی کے لئے میں اسے صرف ڈورا ہی کہے لیتا ہوں ـــ تو ڈورا ہمیشہ اسی طرح ہنستی ہے، اور ڈورا کی باتیں! ـــــ تم نے کوئل کی آواز تو ضرور سنی ہو گی۔ تو اگر کوئل انگریزی بولنے لگے تو بالکل ڈورا کی طرح بولے گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے سینے میں کوئی ساز چھپا ہوا!

ہے اور اس کے ہونٹ اس ساز کے پردے ہیں، اور وہ باتیں نہیں کر رہی، نغمے برسا رہی ہے، پھر ایک دم ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آوازیں تو کہیں دور سے آ رہی ہیں۔ کسی دور دراز جزیرے کے ایک گھپ اندھیرے کنج میں کوئی وائلن بجا رہا ہے اور وائلن کے سُر ہوا کے بازوؤں پر لد کر آتے ہیں، اور میو روڈ کے اس فلیٹ پر چھن چھن برس پڑتے ہیں۔

تم سمجھتے ہو، میں مبالغہ کر رہا ہوں، اس لئے کہ میں شاعر بھی ہوں، مگر یقین کرو کہ اگر مجھے شاعری ہی کرنا ہوتی تو میں ڈورا پر نظم لکھتا، اور اس وقت میں شاعری نہیں کر رہا، تمہیں ایک کہانی سنا رہا ہوں،

اور کہانی ڈورا کی ہنسی ہی سے شروع ہوتی ہے۔

میں جب کوئی ایک مہینہ پہلے اس فلیٹ میں داخل ہوا تو چار بجے تھے، کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کا ایک چھنا کا سنائی دیا اور میں ٹھٹک گیا۔ مسز سکوڈا عقب میں میرے ساتھ آ رہی تھیں ورنہ ممکن ہے میں دیر تک یونہی ٹھٹکا کھڑا رہتا، تمہیں معلوم ہے چھنا کا ٹھٹکا ہی دیتا ہے۔

مسز سکوڈا ہی نے اپنے فلیٹ کا یہ کمرہ مجھے سب لٹ کیا تھا، انہوں نے فوراً ہی اس کمرے کی خوبیوں کے متعلق اور اس کی ان خامیوں کے متعلق جو بقول ان کے اب خوبیوں میں بدل چکی تھیں، مجھے اطلاعات بہم پہنچانا شروع کیں۔ انہوں نے کچھ یوں مسلسل باتیں کیں کہ گھنگھروؤں کا چھنا کا میرے ذہن سے نکل گیا اور پانچ بج گئے، اور اگرچہ اب مجھے ایمان کی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ لاہور کی کوئی عمارت مسز سکوڈا کے اس فلیٹ کے مقابل نہیں آ سکتی اور باغ جناح

کے آس پاس بنگلوں میں رہنے والے لوگ زندگی نہیں گزار رہے جھک مار رہے ہیں۔ لیکن مسز سکوڈا کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں نے انہیں بر وقت نہ روکا تو وہ مزید ایک گھنٹہ پونے چلی جائیں گی اور میرا سارا پروگرام تلپٹ ہو جائے گا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ان کے دریائے فصاحت و بلاغت کے سامنے بند باندھے بغیر نہ رہوں گا،

وہ بولیں "اب اسی روشن دان کو لیجئے"

میں نے فوراً کہا "جی میں نے روشن دان کو داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا، بہت اچھا ہے۔"

بولیں "آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، میں حیران ہوں روشن دان میں شیشے جوڑ دینے کے بعد بھی اسے روشن دان ہی کیوں کہا جاتا ہے، تازہ ہوا کا ایک شمہ بھر بھی اندر نہ آئے تو آپ ہی کہیے روشن دان روشن دان کیسے ہوا۔ ڈیم اِٹ!"

"ڈیم اِٹ" میں نے بند باندھنا چاہا۔

مگر مسز سکوڈا کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور بولیں "کتنی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ آپ ہر بات میں میرے ہم خیال ہیں۔ تو ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس روشندان پہ دو کبوتر آ بیٹھے، پرلی طرف گلی میں سے کسی لڑکے نے غلیل سے ان پہ نشانہ باندھا اور دونوں شیشے کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے، رابرٹ نے تو مارے غصے کے پنجابی میں ایک گالی تک بک دی۔ ڈورا بھی طیش میں آ گئی۔ مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے تو آنے کا دروازہ کھل گیا ہے۔ یعنی

اوقات ایک حادثہ زندگی کے کسی معمے کا حل بن جاتا ہے۔ سو اس کمرے میں تازہ ہوا کا سیلاب آگیا۔ اگر پرلی طرف گوجروں کے مکان نہ ہوتے اور گائیں بھینسوں کی گندگی کی جو تازہ ہوا میں شامل نہ ہوجاتی تو پھر تو یہ کمرہ مری کے کشمیر پوائنٹ کا مقابلہ کرتا۔ تازہ ہوا کے بغیر مجھے تو انسان اُلو معلوم ہونے لگتا ہے"!

میں نے کہا۔ "اُلو بھی تو ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

مسز سکوڈا قہقہہ مار کر ہنسیں۔ "ونڈر فل، ونڈر فل، نائیس جوک!"

خاموشی کے ذرا سے وقفے سے میں نے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی، مگر اپنے اگلے اقدام کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ مسز سکوڈا نے بند توڑ دیا۔ "ہمارے ہاں فن تعمیر کا تصور یہی پرانا اور کرم خوردہ ہے، نیلبٹ مال روڈ پر ہے مگر اندر جاؤ تو ایسا لگتا ہے جیسے قدیم بغداد میں داخل ہو گئے ہیں، قدیم بغداد پہ میرے پاس ایک کتاب ہے، آپ بھی پڑھئے گا، ان دنوں ڈورا پڑھ رہی ہے۔" مسز سکوڈا نئے موضوع کی تلاش کے سلسلے میں رکیں۔

میں نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا چاہا۔ لیکن آنکھیں سے آنکھیں مل ہی نہ سکیں اس لئے بولنا بھی مشکل ہوگیا۔ دراصل مسز سکوڈا کی ایک آنکھ کو امتدادِ زمانہ نے ذرا سا کیٹرا کر دیا تھا۔ اور میری جو آنکھ ان کی اس آنکھ سے ملی وہ مجھے اپنے محور سے ہٹتی معلوم ہوئی۔ میں نے آنکھیں ملنے کے لئے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس دوران میں انہیں ایک اور موضوع ہاتھ لگ گیا۔

"بے شک یہ لکڑی کی پارٹیشن شروع شروع میں آپ کو کھلے گی، مگر آپ بہت جلد اس کے عادی ہو جائیں گے، انسان عجیب جانور ہے (یعنی تم عجیب جانور ہو) بھڑکتی آگ میں ڈال دو، پہلے تو تڑپے گا، پھڑکے گا، بلبلائے گا اور پھر بانسری بجانے لگے گا (یعنی مر جائے گا: میں نے کہنا چاہا مگر ہم خیالی کا جذبہ آڑے آ گیا) میری ڈورا ساتھ والے کمرے میں ڈانس کی مشق کرتی ہے اور ساتھ ساتھ ڈانس کی ٹیون بھی گنگناتی ہے ممکن ہے اس کی آواز آپ کو شروع شروع میں کھلے کیونکہ میں نے سنا ہے آپ جرنلسٹ ہیں، لیکن آپ بہت جلد اس کے اس قدر عادی ہو جائیں گے کہ آپ کو ڈورا کی آواز کا انتظار رہے گا۔ رہا رابرٹ، تو وہ چند ہی دنوں میں کراچی جا رہا ہے، وہاں اسے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں کام مل گیا ہے یہاں رہتا تو آپ اس کے بھی عادی ہو جاتے، آپ اسے بڑا اچھا دوست پاتے، آپ سے پہلے جو صاحب یہاں رہتے تھے وہ شاید افیون کے ٹھیکیدار تھے، مگر تھے بہت پیارے آدمی، رابرٹ ان کا تو بالکل چھوٹا بھائی بن گیا تھا۔ بریک فاسٹ وہیں کر رہا ہے، شیو وہیں بنا رہا ہے۔ کبھی کبھی لنچ تک وہیں کھا لیتا تھا۔ اکٹھے سینما جا رہے ہیں، اکٹھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں، میں حیران ہوں وہ صاحب ایکا ایکی یہ فلیٹ چھوڑ کر کیوں چلے گئے، اور کہاں چلے گئے، حد یہ ہے کہ آج پندرہ دن ہونے کو آئے ہیں انھوں نے اپنے رابرٹ کی بھی کوئی خبر نہیں لی (کہیں رابرٹ کا شیو تو نہیں بڑھ آیا: میں نے پوچھنا چاہا۔ مگر ———)

سو وہ میں کیا کہہ رہی تھی؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ رابرٹ کراچی جا رہا ہے، باقی رہ گئی میں، تو میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے، رات کو ایک آدھ بار کھانس لیتی ہوں بہت ہوا تو کبھی ڈورا کو اس کی شوخیوں پہ جھڑک دیا۔ اس عمر میں انسان کا وجود صفر کے برابر ہو جاتا ہے، آپ میری طرف دیکھئے ــــــ ذرا دیکھئے نا"

میں نے اس کی طرف دیکھا آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی مگر چار نہ ہوئیں۔ صرف دو نہ ہوئیں۔ اور پھر یہ دو بھی نہ رہیں، میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھ بھی کیٹری ہو رہی ہے۔ جلدی سے میں نے اپنی آنکھیں مل دیں۔ بس ایک ثانیے میں جب ہماری آنکھیں دو ہوئی تھیں تو میں اتنا دیکھ پایا تھا کہ مسز سکوڈا نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو ہتھیلی میں لے رکھا ہے۔ اور اب وہ بولنے لگیں: "ایک زمانہ تھا جب میں چمڑے کی اس تھیلی میں اکٹھی تین ٹھوڑیاں لئے پھرتی تھی، میں اتنی تندرست اور موٹی تھی کہ حیران رہتی تھی آخر یہ جسم کی اتنی ڈھیروں چربی اور گوشت کب تک سنبھال سکوں گی، اچانک جونسن کو خدا نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور تب سے میرے سارے جسم پہ تھیلے اور تھیلیاں لٹک آئیں"۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکیں۔ رومال نکال کر اس زور سے ناک صاف کی کہ روشندان میں بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گئے، میں نے بھی دہل کر ان کی طرف دیکھا، وہ رو رہی تھیں اور میں حیران تھا کہ اس نازک موقع پہ ان سے کیا کہوں، بڑی کوشش کے بعد میں نے "مسز سکوڈا" کے الفاظ کچھ اس طرح ادا کئے کہ ان میں بیک وقت تسلی بھی تھی، ہمدردی بھی، اور حیرت بھی! "آئم سوری" انہوں نے کہا اور جانے کے لئے پلٹیں کہ ادھر سے ڈورا کی غصے میں بھری ہوئی آواز آئی، "ڈرٹی گوانگ آن ممی!" ــــــ یہ

پہلا موقع تھا کہ میں نے اس فلیٹ میں کوئل کی آواز سنی تھی۔

مسز سکوڈا کے جانے کے بعد میں نے پہلی بار کمرے کا جائزہ لیا یہ ایک مستطیل شکل کا کمرہ تھا۔ اور اگر لکڑی کی پارٹیشن نے اس کے دوسرے حصے کو الگ نہ کر دیا ہوتا تو ممکن ہے یہ مربع شکل ہوتا بہرحال اب ایک مربع دو مستطیلوں میں بٹ چکا تھا، اور ایک مستطیل میرے حصے میں آئی تھی، روشن دان میں کبوتروں کا بسیرا تھا، ان کی بیٹوں نے دیوار پر بہت سی دھاریاں سی کاڑھ دی تھیں۔ ان دھاریوں کے عین نیچے ایک الماری تھی جس کے تختوں پر جون آف آرک کے لباس میں انگرڈ برگمین کی تصویر، ملکہ الزبتھ کے لباس میں بٹی ڈیویس کی تصویر، نپولین کے لباس میں چارلس بائر کی تصویر اور بغیر کسی لباس کے ایک جوان عورت کی تصویر چسپاں تھی۔ اس ننگی عورت کی تصویر کے نیچے مجھے انگریزی میں یہ الفاظ لکھے نظر آئے "وومن۔ دائی نیم از نیکڈنس" (عورت تیرا نام عریانی ہے) نیچے رابرٹ سکوڈا کے دستخط تھے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ زمانۂ حال کا یہ بے مثال فلسفی تو عنقریب کراچی جا رہا ہے، اس کے فیضِ صحبت سے محروم رہ جانا کتنی شدید کوفت کا باعث ہے، جی چاہا اسے ابھی پکار لوں اور اس سے پوچھوں کہ میرے نوجوان دانائے راز!۔ دانش کا یہ موتی تم نے کس سمندر کے ساحل پر کس قسم کی سیپی سے نکالا ہے۔ مگر اس وقت تو میں جسمانی اور ذہنی طور پر تھک چکا تھا، میں جب سے اس کمرے میں آیا تھا، ایک ہی جگہ پر کھڑا تھا۔ مسز سکوڈا نے تو مجھے نہ بیٹھنے کی مہلت دی تھی، نہ بولنے کی، اور نہ سر پھوڑ کر مر جانے کی، الماری کے ایک پٹ سے کوئی

ڈیڑھ گھنٹے تک ٹیک لگا کر کھڑے رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پوری الماری تمہارا حصۂ جسم بن چکی ہے - اور کچھ ایسا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ دیر تک تم اس سوچ میں غرق رہتے ہو کہ الماری اور تم میں سے تم کون ہو اور الماری کون ہے! —— اور یہاں کمرے کا باقی حصّہ ؟ —— تو وہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو، الماری کے بالکل مقابل یہ دروازہ ہے اور بس،

ایک روز مجھے اپنے اخبار کی طرف سے حکم ملا تھا کہ میں شام کے بعد مقبرۂ جہانگیر میں جاؤں، اور چاندنی میں اس کے منظر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اخبار کے لئے ایک مضمون لکھوں جس میں یہ ثابت کروں کہ اگر چاندنی رات میں تاج محل دھرتی کا تاج معلوم ہوتا ہے، تو مقبرۂ جہانگیر انگوٹھی کے نگینے کی طرح دمکتا ہے، میں نے اپنے ایڈیٹر صاحب کو یہ یقین دلانے کی بے حد کوشش کی تھی کہ مقبرۂ جہانگیر تو صرف دن کو دیکھنے کی چیز ہے، میں نے اسے چاندنی رات میں کئی بار دیکھا تھا اور اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے چار طرف پھیلے ہوئے حجروں کے دروازوں میں سے ابھی کوئی غیر انسانی چیزیں برآمد ہو کر دبوچ لیں گی، تاج محل کا سناٹا ایک گیت ہے تو مقبرۂ جہانگیر کا سکوت ایک کراہ، اور نہ جانے یہ فنِ تعمیر کا کوئی نقص ہے یا دیکھنے والوں کی ذہنیت کا، مگر یہ ہے ایک حقیقت، ایڈیٹر صاحب نہیں مانے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ یہ دیکھنے والے کی نیت کا نقص ہے، چاندنی میں مقبرے کے سبک میناروں اور خوبصورت محرابوں سے لطف اٹھانے کی نیت سے جاؤ گے تو لطف ہی آئے گا - سو مجھے نیت بخیر ہو کر آج شام شاہدرے جانا تھا، مگر اب ذہن پر

کچھ ایسا بوجھ آگیا تھا کہ نیت اس کے نیچے ٹوٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، ہم نے سونے کی ٹھانی۔

انسان کے مشاہدے پر نیت کا سچ مچ بہت اثر پڑتا ہے، اور تم یقین کرو کہ اپنے ان پڑوسیوں کے معاملے میں میری نیت بالکل صاف تھی، مگر چند واقعے ایسے ہوئے ہیں کہ مجھے اپنی نیت پر اتنا شبہ نہیں۔ جتنا ان لوگوں پہ، بات یوں ہوئی کہ جب میں کمرے میں سامان جما کر پلنگ پر بیٹھا تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاؤں گا۔ مگر جب تکیے پر سر رکھا تو یوں معلوم ہوا جیسے جب تک میرا سر تکیے پر رہے گا، مجھے نیند نہیں آئے گی، میں نے ایک کتاب "آرٹ کے شہ پارے" اٹھالی اور دنیا کے بڑے بڑے مصوروں کی تخلیقات دیکھنے لگا، نیت گڈمڈ تھی مگر ان تصویریں نے نیت وغیرہ کو اپنے حسن کی گرفت سے درست کر لیا تھا اور میں بڑے مزے سے ورق الٹ رہا تھا جب اچانک میرے فلیٹ کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

آج رات میں صرف سونا چاہتا تھا، شام کو کھانا کھانے تک کو میں نے کل صبح پر ملتوی کر دیا تھا اور چٹکنی لگا کر اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گیا تھا، دستک ہوئی تو ذرا سی کوفت ضرور ہوئی، مگر کوفت سے زیادہ حیرت ہوئی، کسی دوست کو میرے نئے فلیٹ کا علم نہ تھا اس لئے یہ دستک اور بھی پراسرار معلوم ہوئی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو کبوتروں نے روشندان میں کچھ اس انداز میں غٹرغوں کی جیسے وہ شعوری طور پر مجھ پر ہنس رہے ہیں، —— نہیں نہیں میری نیت بالکل ٹھیک تھی، کیونکہ کم بخت بولتے ہی اسی ڈھب سے تھے۔ سو میں نے دروازہ

کھولا، "ہلو نیبر!" آواز آئی "میں رابرٹ ہوں، رابرٹ سکوڈا" ——— اور پھر مصافحے کے لئے میرے ہاتھ کے اٹھنے کا انتظار کئے بغیر وہ درانہ اندر چلا آیا۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا اور ہنس کر بولا "عجیب بات ہے کہ اس کمرے سے میرا انس کم ہی نہیں ہوتا، یہاں کوئی بھی کرایہ دار آ نکلے، میں اس روشن دان، اس الماری، اس پارٹیشن اور پارٹیشن کی اس جھری کو میرا اپنی ملکیت سمجھتا ہوں، غلط بات ہے لیکن ہے سچی بات، اور یہ سچی بات کتنی عجیب ہے!" - وہ پلنگ کی طرف بڑھا اور میری نظریں پارٹیشن میں جھری تلاش کرنے لگیں۔ لیکن میں نے فوراً نیت پر قابو پا لیا اور رابرٹ کے پاس آکر اپنا ہاتھ بڑھایا "میرا نام طارق ہے" وہ ذرا سا شرمندہ ہو گیا، ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بولا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!" پھر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "آرٹ کے شہ پارے" اٹھا کر ورق الٹنے لگا "اوہ ونڈرفل، آفلی ونڈرفل" اس نے پکاسو کی ایک تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس تصویر میں پکاسو صرف ایک لنگوٹ باندھے اپنی چند تصویروں کے پاس پہلوانوں کی طرح اکڑ کر کھڑا تھا، اور رابرٹ پکاسو کے فوٹو ہی کو پکاسو کا فن پارہ سمجھ رہا تھا کیونکہ اس نے پکاسو پر انگلی پھیری اور کہا "بالکل جیتا جاگتا انسان معلوم ہوتا ہے!" میں نے اس کی تصحیح کی ضرورت نہ سمجھی، اور پلنگ کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

رابرٹ کھلتے ہوئے رنگ کا نوجوان تھا، طرار اور بے چین قسم کا نوجوان، شباب کا گرم خون اس کی رگوں میں رینگنے کے بجائے ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا، صرف

اس کی آنکھیں بہت بجھی بجھی سی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیر کر ان کی خشکی کو چاٹ لیتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ کراچی کب جا رہے ہیں؟"

حیران ہو کر بولا "کراچی؟ میں کراچی وراچی نہیں جا رہا۔ آپ کو کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "آپ کی ممی نے"

کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا اور بولا "اوہ، آئی سی، تو وہ میں اب نہیں جا رہا"

"کیا مشاغل ہیں آپ کے؟" میں نے پھر ایک سوال کیا۔

"مشاغل؟" اس نے پوچھا، اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا "پتنگوں کے پر اور ٹوتھ پیسٹ ٹیوبوں کی ٹوپیاں اور —— اور تاریخی شخصیتوں کی تصویریں جمع کرنا"

میں نے الماری کے ایک پٹ پہ چپکی ہوئی ننگی عورت کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا "یہ کون تاریخی شخصیت ہے؟"

رابرٹ سکوڈا بے اختیار ہنسنے لگا، پھر اس نے میرے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے بولا "یہ ازلی اور ابدی عورت ہے۔ یہ وہ عورت ہے جسے ہم حوا کہتے ہیں، اور یہی وہ عورت ہے جو ادھر ادھر آپ کے ایڈویس پڈس میں رہتی ہے، یہ مجسم عورت ہے!"

رابرٹ سکوڈا مجھے ایک دم پچاس برس کا بڈھا معلوم ہونے لگا، میں دانش

کے ان موتیوں کو ابھی چن ہی رہا تھا کہ اس نے تپائی پر سے میرا قلم اٹھا لیا اور بولا "یہ بڑا نفیس ڈیزائن ہے!"

میں نے کہا "نہیں خاصا پرانا ڈیزائن ہے، ایور شارپ ہے، ہر جگہ ملتا ہے"۔

وہ بولا "لیکن میں نے ایور شارپ کا یہ ڈیزائن پہلے کہیں نہیں دیکھا"۔

"ممکن ہے" میں نے کہا۔

اور اس نے اپنی آواز میں بڑی نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "آپ اجازت دیں تو میں یہ قلم ایک آدھ دن کے لئے لے جاؤں، میں دکان دار کو یہ نمونہ دکھا کر اسی ڈیزائن کا خود بھی خریدنا چاہتا ہوں، لے جاؤں؟"

انکار کے راستے مسدود تھے، سو میں نے کہا "ضرور لے جائیے، عام ملتے ہیں"۔

"شکریہ" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازے کے پاس جا کر مڑا "شب بخیر"۔

"شب بخیر" میں نے کہا، اور فلیٹ کا دروازہ بند کر دیا۔

پارٹیشن کی جھری میں سے میں نے دیکھا کہ رابرٹ روشنی میں کھڑا میرے قلم کو گھما گھما کر دیکھ رہا ہے، پھر کچھ دیر کے بعد کومل کی آواز آئی "لٹ بی سی رابی" اور ڈورا جھری کے فوکس میں آ گئی، وہ سر سے پاؤں تک مشرقی عورت تھی ہمارے ہاں عورت کی خوبصورتی کا ایک اپنا تصور ہے، سو ڈورا مجھے اس تصور کی ایک مثال نظر آئی۔ اس نے رابرٹ سے قلم لیا نہیں بلکہ چھین لیا اسے اپنے بلاؤز میں

چھپاکر رقص کے دو تین دائرے بنائے اور ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی،

اور میں رات بھر اسی کی ہنسی کے گھنگھرو اور گھنٹیاں چنتا رہا، نیت بخیر مجھے خوب نیند آئی، صبح کو کبوتر روشندان میں شور نہ مچاتے تو ممکن ہے میں دوپہر تک سویا رہتا،

دوسرے دن میں شام تک دفتر میں رہا اور پھر وہیں سے شاہدرے چلا گیا، لیکن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اس لئے چاند بھی غائب رہا۔ اور میں دس بجے تک گاہے گاہے چمکتے ہوئے بادلوں پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا، اس دھندلکے میں مقبرہ زمین سے کچھ یوں اٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا میں معلق ہے، حجرو ں کے دروازوں میں اندھیرا عجیب عجیب صورتیں بدل رہا تھا، گھاس کے قطعے کالے پانی کی جھیلیں معلوم ہوتے تھے، مایوس ہو کر میں واپس لاہور آ گیا اور جب گیارہ بجے رات فلیٹ میں داخل ہوا تو ڈورا اور رابرٹ سکوڈ رقص کے ساتھ ساتھ رقص کی کوئی ٹیمرن گا رہے تھے، روشنی کئے بغیر میں نے جھری میں سے دیکھا، ڈورا اور رابرٹ نے وہی کل رات والا لباس پہن رکھا تھا، البتہ آج ڈورا کے سر پہ بالیاں میں گھونگھر ڈالنے والے بہت سے کلپ چمک رہے تھے، وہ ناچنے اور گانے کے ساتھ ساتھ مسکرائے جا رہی تھی؛ اور مسکراتے ہوئے اس کے ایک رخسار میں ایک قوس سی اور دوسرے پر ڈمپل پیدا ہو جاتا تھا، اور یہ چیزیں کچھ ایسی نمایاں نظر آنے لگتی تھیں، جیسے مصنوعی ہیں اور کلپ لگا کر پیدا کی گئی ہیں جھری میں سے دیکھتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی جلائی تو وہ دونوں رک گئے اور

خاموش ہو گئے۔ "سویٹ!" ڈورا نے آہستہ سے کہا۔ اور رابرٹ دانش ورون کے سے دبدبے سے بولا۔ "ہی از اے جرنلسٹ، اے نائٹ برڈ!"——

اچانک ڈورا میری طرف بڑھی، اور میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور پھر ٹہلنے لگا۔ اور مجھے یوں معلوم ہوا کہ جھری میں سے اس کی نظر ایک محسوس اور مرئی صورت اختیار کر کے میرا پیچھا کر رہی ہے، میں نے گھبرا کر بجلی بجھا دی اور پلنگ پر گر پڑا۔ اور جب کچھ دیر کے بعد ادھر کی بجلی بھی بجھا دی گئی، تو اپنے کمرے میں روشنی کر کے میں نے "مقبرۂ جہانگیر دھندلکے میں" کے عنوان سے اخبار کے لئے فیچر لکھنے کی ٹھانی، اس وقت مجھے اپنا قلم یاد آیا، جی چاہا آہستہ سے دستک دے کر رابرٹ سے قلم مانگ لوں مگر پھر سوچا کہ ممکن ہے وہ سو گئے ہوں اور میری یہ حرکت خلاف تہذیب سمجھی جائے، پنسل ہی سے چند صفحے لکھے اور سو گیا۔

یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے، میں تیار ہو کر دفتر جا رہا تھا، بلڈنگ کی سیڑھیوں پر سے اتر کر چوکیدار سے سائیکل لے رہا تھا جب ایک ہرکارہ آیا اور مجھ سے میرے ہی نام کا پتہ پوچھنے لگا، یہ میرے بڑے بھائی کا تار تھا جس میں لکھا تھا کہ ایک مہینے کے بعد بھانجی کی شادی ہونے والی ہے، اس لئے ابھی سے سامان خریدنے کی فکر کرو، تار لے کر میں نے فارم پر دستخط کرنا چاہے مگر ہرکارے کی پنسل کا سکہ گھس چکا تھا اور میں اپنی پنسل فلیٹ میں بھول آیا تھا۔ اتفاقاً سیڑھیوں پر سے رابرٹ اترا۔ میں نے کہا: "آپ کے پاس پنسل ہو گی؟" اس نے جیب سے فوراً میرا قلم نکالا، اس کی ٹوپی اپنے پاس رکھ لی اور قلم مجھے دیتے ہوئے بولا: "خیریت تو ہے؟" میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا: "خیریت ہی ہے، ایک عزیزہ کی

شادی کی تاریخ کی اطلاع ہے "۔ میں دستخط کر چکا تو اس نے قلم میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر ٹوپی چڑھا کر جیب میں رکھنے لگا تھا کہ ایک دم اس کا رنگ زرد پڑ گیا، اور ذرا سی کانپتی ہوئی آواز میں بولا "معاف کیجئے گا۔ آپ ہی کا قلم ہے!" ۔ اور قلم کو میرے ہاتھ میں ٹھونس کر اور پلیٹ کر وہ بڑی تیزی سے سیڑھیوں میں غائب ہو گیا۔

میرے دل کو شدید دھکا لگا، یہ قلم ایک گالی بن کر میرے جسم سے چپک گیا تھا، اسے جیب میں رکھے بغیر میں پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں نے مسز سکھوڈا کے فلیٹ پر دستک دے دی، ایک لمحے کے بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ ڈورا نے کھولا تھا، اس نے رات ہی کا لباس پہن رکھا تھا، بے شمار گھونگھروں کے سبب بال اس کے سر پہ ایک بڑی سی ٹوپی بن کر جمع ہو گئے تھے، اور اس کی لمبی آنکھوں میں مقبرۂ جہانگیری کی سی دھند تھی۔ "ہلو" اس نے کہا۔ اور پھر فوراً ایک طرف ہٹ کر بولی "آیئے"۔ میں اندر چلا گیا۔ "بیٹھئے" اس نے کہا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ صوفہ ان بھاری بھرکم صوفوں میں سے تھا جن پر بیٹھنے سے انسان ان میں غرق ہو جاتا ہے، گھٹنے اوپر اٹھ جاتے ہیں، اور فرش اور سیٹ کے درمیان صرف چند انچ کا فرق رہ جاتا ہے، میں صوفے میں غوطہ لگانے کے بعد ایک بار ابھرا اور اس کے پرلے گوشے میں ذرا آرام سے بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر میں پھر غرق ہو گیا اور آخر اسی حالت پر قانع ہو کر بولا "آپ بھی تو بیٹھئے" ——— وہ "شکریہ" کہہ کر سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اور میں قلم کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے بولنے کی ہمت کی "یہ قلم شاید مسٹر رابرٹ کا ہے، میں نے دستخط کرنے کے لئے ان سے مانگا اور وہ اسے واپس لئے بغیر چلے آئے"

"یہ قلم آپ ہی کا ہے" ڈورا بولی اور ساتھ ہی مسکرا دی بھی۔ مگر اس کے گالوں پر قوس اور ڈمپل پیدا نہ ہوئے۔ "رابرٹ نے اسی ڈیزائن کا قلم خرید لیا ہے۔ صرف رنگ میں فرق ہے۔ یہ چاکلیٹ ہے اور وہ ——— وہ نیلا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے کہا "خوب، اس ڈیزائن کے لئے نیلا رنگ تو واقعی بہت اچھا رہے گا۔ میں وہ قلم دیکھ سکتا ہوں؟"

ڈورا کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا۔ ہاتھوں کو گھٹنوں کے درمیان دبا کر بولی "رابرٹ آجائے تو دیکھ لیجئے گا — ضرور دیکھئے گا۔"

اخبار نویسوں کی بے رحم حقیقت پسندی میری عادت بن چکی ہے۔ میں نے کہا "مگر مسٹر رابرٹ تو ابھی ابھی بس چند منٹ ہوئے ادھر آئے ہیں۔"

"جی نہیں" اس کی آواز میں گونج پیدا ہو گئی۔ "وہ یہاں نہیں ہے، شاید اسی بلڈنگ میں کسی دوست کے پاس چلا گیا ہو۔ اس کے بے شمار دوست ہیں، اس کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ وہ جس سے بھی متعارف ہوتا ہے، وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔" وہ بولی چلی گئی،

موضوع کو ختم کرنے کے لئے میں نے کہا "آپ نے پڑھی، ایک کتاب ہو گی — قدیم بغداد ...."

"قدیم بغداد۔!" اس نے حیرت سے کہا "جی نہیں میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں"

"مسز سکھوڈا کہہ رہی تھیں" میں نے سچا بننا چاہا۔

اس کا رنگ پھر اڑ گیا۔ نرم چہرے پر اس کے ہونٹوں کی سرخی میں نیلا ہٹ سی دوڑ گئی اور اس نے گھٹنوں کی گرفت سے اپنے ہاتھوں کو چھڑا کر انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں، پھر ایک دم وہ اپنی انگلیوں کی آواز سے چونکی اور بولی "آئم سوری"۔ اور پھر کسی وقفے کے بغیر ایک ہی سانس میں بولنے لگی۔

"ممی کے پاس ہو تو ہو، میرے پاس تو نہیں ہے، میں ممی سے پوچھوں گی، اور انہوں نے کسی اور کو نہ دے دی ہو تو کل پرسوں تک آپ کو بھجوا دوں گی، بڑی اچھی کتاب ہو گی، نام ہی میں کتنا رومانس ہے، قدیم بغداد، الف لیلہ اور ہارون الرشید اور پڑھے جادوگر۔ ضرور پڑھیے گا۔"

ایک لمبی سانس لے کر وہ مسکرائی اور بولی "میرا نام ڈورو تھی ہے — ڈورو تھی سکھوڈا!"

"اور میرا نام طارق ہے" میں نے کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی بہت خوشی ہوئی" وہ کھل کر مسکرائی، اور اس کے ایک رخسار میں قوس اور دوسرے میں ڈمپل پیدا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سرخ ہو گئے، آنکھوں کی دھند چھٹ گئی، کان کے نیچے گردن پر تڑپتی ہوئی ایک نس کی حرکت میں سکون آ گیا۔ اور وہ کچھ ایسے اطمینان سے مجھے دیکھنے لگی جیسے کوئی فاتح میدان جنگ میں ہر طرف دشمنوں کی بکھری ہوئی لاشیں دیکھ رہا ہو۔

میں وہاں سے اٹھ کر اپنے فلیٹ میں آیا اور فوراً جھری پر اپنی آنکھ رکھ دی۔ رابرٹ شعبی کمرے میں سے نکلا اور بہن بھائی ایک دوسرے سے اس تپاک سے ملے جیسے برسوں سے جدا تھے، مسز سکوڈا بھی جھری کے فوکس میں آگئیں، وہ مسکرا رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، پھر ڈورا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، اور رابرٹ اداس ہو کر صوفے میں ڈوب گیا۔

میں جھری پر سے ہٹ آیا، کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اکٹھے تین قتل کر کے آ رہا ہوں، میرا دل بھینچ بھینچ کر دھڑکنے لگا اور میں نے قلم کو میز پر اس زور سے پٹخا کہ اگر معمولی قلم ہوتا تو اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔

آئندہ چار پانچ روز ایک خلا میں گزرے، میں اپنے پڑوسیوں سے کتراتا تھا تو میرے پڑوسی مجھ سے کتراتے تھے، میرے آتے ہی فلیٹ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا، مسز سکوڈا کی کھانسی کی آواز تک سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ضبط کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ میں نہ سن پاؤں، ڈورا اور رابرٹ تو بالکل غائب ہی ہو گئے تھے، خود میں نے بھی کھوج لگانے کی کوشش نہ کی، میرے دل میں چور سا تھا، اور بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے وقت خواہ مخواہ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی تھی۔

یہ میرے فلیٹ میں آنے کے کوئی دس دن بعد کا ذکر ہے، میں رات کے نو بجے دفتر سے آیا، روشنی ابھی نہیں کی تھی کہ پارٹیشن کے ایک طرف مجھے ڈورا اور رابرٹ سرگوشیوں میں بولتے سنائی دیئے "تم جانا"۔ ڈورا کہتی "نہیں تم"۔ رابرٹ کہتا، یہ گردان کچھ دیر تک جاری رہی جب مسز سکوڈا کی آواز آئی "تم ہی چلی جانا

ڈورا۔ قلم کے حادثے کے بعد رابرٹ اس کے سامنے جانے سے گھبراتا ہے، ویسے بھی مرد لوگ دکھاوے ہی کے لئے سہی عورت کا احترام کرہی بیٹھتے ہیں!" گفتگو کا موضوع میں تھا اس لئے میں نے فوراً بجلی جلا دی، اور سرگوشیاں کٹ گئیں، ابھی جوتوں کے تسمے ہی کھول رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے لپک کر دروازہ کھولا تو ڈورا اندر آگئی، اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا، بالوں کے گھونگھر ہموار ہو گئے تھے، اور ناخنوں کا پالش کھنڈروں کے پلستر کی طرح اکھڑا ہوا تھا۔ وہ بولی "معاف کیجئے گا، میں بے وقت آئی، اصل میں بات وہی ہوئی جو میں نے کہی تھی، ممی نے "قدیم بغداد" اپنی ایک دوست کو دے دی تھی، آج ہی رابرٹ واپس لایا ہے، میں نے کہا آپ نے اتنے شوق کا اظہار کیا تھا اس لئے آج ہی پہنچا دوں، یہ لیجئے"۔ اس نے ایک ضخیم کتاب میرے ہاتھوں میں دے دی اور جانے کے لئے پلٹی۔

"بہت بہت شکریہ" میں نے کہا "مگر آپ چلیں کہاں؟ ایک منٹ بیٹھئے تو"

ڈورا جہاں رکی تھی وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی "شکریہ" اس نے کہا، اور میں کتاب کھول کر دیکھنے لگا۔

پہلے صفحے پر جانسن سکوڈا کے دستخط تھے اور نومبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ، کتاب میں بے شمار تصویریں تھیں اور بہت خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہوئی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ کتاب بہت نئی ہے، آٹھ نو برس پرانی کتاب اگر پڑھی نہ بھی جائے، جب بھی ذرا سا رنگ ضرور بدل لیتی ہے مگر اس کتاب میں سے تو اس کے

سُنے پن کی خوشبو آ رہی تھی ،

ہم چند لمحے چپ چاپ بیٹھے رہے ، خاموشی کو بھدے پن کی حد کو چھوتے دیکھ کر میں نے کہا " بہت دنوں سے مسٹر رابرٹ کو نہیں دیکھا۔"

ڈورا بولی " وہ بیمار رہے ، انفلوائنزا نے اسے چار دن تک پریشان رکھا"

" اور مسز سکوڈا؟" میں نے پوچھا۔

" ان کا بھی جسم ٹوٹتا رہا۔ باہر بہت کم نکلیں" وہ بولی " موسم ہی کچھ ایسا ہے۔"

میں نے ایک پل کی خاموشی کے بعد کہا " اور آپ؟"

" میں!" وہ حیران رہ گئی ، جیسے اسے اس سوال کی توقع ہی نہ تھی۔ پھر وہ آنکھیں جھکا کر مسکرا دی اور اس کے رخساروں پر قوس اور ڈمپل ابھر آئے " میں تو ٹھیک تھی ، ویسے ہی بس ———— ویسے ہی پڑی رہی۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

موضوع ختم ہو گیا تھا۔ ڈورا کو بھی شاید اسی کا انتظار تھی ، اجازت مانگی اور اٹھ کر جانے لگی۔ دروازے کے پاس جا کر اس نے پلٹ کر کہا " شب بخیر۔"

" شب بخیر" میں نے مردانہ وار ذرا سا جھک کر کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کتاب کو پڑھنے کے شوق کے بجائے اس خیال سے اٹھایا کہ ابھی ابھی یہ ڈورا کی لمبی لمبی انگلیوں کی گرفت میں تھی ، بیوقوفی کی بات ہے لیکن مجھے ڈورا کا نرم اور نارمل رویہ دیکھ کر اس سے انس سا ہو رہا تھا ، میں نے اُنس کا لفظ بہت محتاط ہو کر استعمال کیا ہے ، تاکہ تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا میں نے ایک دو بار محبت کی ہے اس لئے تجربے

کی بنا پر کہ رہا ہوں کہ مجھے ڈورا سے انس سا ہو رہا تھا، اور انس تو بھیک مانگنے والی ایک ذرا سی بچی سے بھی ہو سکتا ہے اور پنجرے میں چہکتی ہوئی مینا سے بھی۔

سو میں نے ڈورا سے اُنس کے مارے کتاب اٹھائی، اور میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۵۱ء تھا۔ تو کیا جانسن سکوڈا نے کتاب کی اشاعت سے آٹھ سال پہلے ہی اس پر دستخط کر دئیے تھے؟ میں چکرا کر بیٹھ گیا، سارے حالات میری سمجھ میں آ گئے، مسز سکوڈا، ڈورا اور رابرٹ نے اپنا بھرم رکھنے کے لئے کہیں سے تیرہ روپے جمع کر کے آج ہی یہ کتاب خریدی تھی اور سنِ اشاعت کو دیکھے بغیر اس پر آٹھ سال پہلے کے دستخط ثبت کر دیئے تھے،

قلم کے بعد آج یہ کتاب میرے ہاتھوں سے گالی بن کر چمٹ گئی تھی، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس کتاب کی موجودگی سے میرے ذہن پر کیا کیا کیفیتیں طاری ہوئیں، میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ پڑھا، ایک تصویر تک نہ دیکھی، بس بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس کتاب میں ایک پورے گھرانے کا ناموس دفن ہے، اور اسے پڑھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اس ناموس کی قبر کھود رہا ہوں۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے مسز سکوڈا کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ رابرٹ نے کھولا ”اوہ ہلو!“ اس نے بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بڑا افسوس ہے کہ ان دنوں میں آپ سے مل نہیں سکا، چند روز بیمار رہا اور پھر چند روز ایک نجی کام میں مصروف رہا، آپ کیسے رہے؟“

میں نے اندر صوفے میں غرق ہوتے ہوئے کہا ”شکریہ، میں تو بالکل تندرست

ہوں، البتہ دفتر کی مصروفیت نے چکرائے رکھا، — میں یہ کتاب واپس دینے آیا تھا۔"

"اوہ!" وہ بولا۔ "قدیم بغداد" پھر وہ پکارا۔ "ممی"

مسز سکوڈا اندر آئیں، میں ادب سے اٹھا اور پھر بیٹھنے لگا تو ڈورا اندر آ گئی، بیٹھتے بیٹھتے میں پھر اٹھا اور پھر مونے میں ڈوب کر کہا "اتنی دلچسپ کتاب میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں پڑھی۔ اور پھر اتنی معلومات افزا کہ میں تو اب تک اپنے آپ کو بغدادی کہنے پر مصر ہوں، یہ کتاب تو میرے ذہن پر چھا گئی ہے۔"

مسز سکوڈا نے مسکرا کر کتاب کی تعریف یوں قبول کی، جیسے وہی اس کی مصنف ہیں، پھر بڑے وقار سے آہستہ آہستہ بولنے لگیں "جانسن کو یہ کتاب جان سے زیادہ عزیز تھی۔ کہتے تھے یہ کتاب مجھے اس سرزمین کی یاد دلاتی ہے جس میں سے خدا کے پیغمبر اٹھے ہیں۔ میں نے تو اس کتاب پر جانسن کی یادگار کے لئے غلاف چڑھا دیا تھا۔ ڈورا ڈیر۔ تمہیں یہ کتاب ضرور پڑھ لینی چاہیئے۔ تم نے پڑھ لی ہے رابرٹ؟"

"جی ہاں" رابرٹ نے کہا، اور مجھے کیپسٹن کا ایک سگریٹ پیش کیا۔

میں نے مسز سکوڈا اور ڈورا سے سگریٹ پینے کی اجازت لے کر جب ایک دو کش لگائے تو ذائقہ کیپسٹن سے مختلف معلوم ہوا۔ لیکن میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں سگریٹ کے برینڈ کا سراغ لگا رہا ہوں۔ میں نے باتوں باتوں میں دیکھ لیا کہ سگریٹ لیگے کا ہے جسے کیپسٹن کی ڈبیا میں رکھ دیا گیا تھا۔ دل میں کوئی چیز ٹوٹتی سی معلوم ہوئی۔

میں بڑی آسانی سے ان کا پڑوسی ہونے کے باوجود ان سے الگ تھلگ

رہ سکتا تھا۔ لیکن ان کی انہی کمزوریوں کے جادو نے مجھے مجبور کر دیا کہ اگر میرے پاس ان کی نگری میں داخل ہونے کا وقت نہیں ہے۔ تو کم از کم اس نگری کی سرحد پر تو ضرور منڈلاتا رہوں، اور میں چودہ پندرہ روز اور یونہی منڈلاتا رہا، پارٹیشن کی پرلی طرف سے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کے چھناکے سنتا رہا، انگریزی میں بولتی ہوئی کوئل کی باتیں سنتا رہا، مسز سکوڈا کی اتنی باتیں سنیں کہ اگر چاہوں تو ان کے سوانح لکھ سکتا ہوں، رابرٹ تو میرے بہت قریب آگیا۔ شیو وہیں بنا رہا ہے، بریک فاسٹ وہیں کر رہا ہے، بعض اوقات لنچ تک میرے ساتھ کھا لیتا تھا۔ ہم اکٹھے سینما دیکھنے جاتے، اکٹھے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے تھے، اور ان پندرہ دنوں میں پندرہ برس کی مدت طے کر گئے تھے، ڈور اسے مجھے جو انس تھا وہ دوستی کی صورت اختیار کرنے لگا، ایک روز وہ میرے لئے کہیں سے ایک گلدستہ لے آئی، اور اسے میرے تپائی پر سجا کر خوش ہو کر اتنی ہنسی کہ تو سوں اور ڈمپلوں کا مینہ برس پڑا۔ پھر ایک روز اس نے میری پتلون کا ایک بکل ٹوٹا ہوا دیکھا تو فوراً سینے پر سے ایک سیفٹی پن نکالا اور بکل کی کمی پوری کر دی۔

اور یہ کل شام کا واقعہ ہے کہ میں اپنی بھانجی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بازار گیا۔ میں نے اس کے لئے پانچ گز جارجٹ کے خریدے اور جب اپنے فلیٹ میں آیا تو رابرٹ کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا آیا اور جارجٹ کو دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا۔ پھر اس نے کپڑے کو چھوا اور بولا۔ "کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ یہ مردانہ کپڑا نہیں"

میں نے کہا "ہاں ہاں، یہ زنانہ کپڑا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی اور وہ بولا، "کس کے لئے ہے؟"

میں نے کہا: "میری بھانجی کی شادی ہونے والی ہے، اس کے لئے خریدا ہے۔"

رابرٹ کے چہرے پر سے مسکراہٹ بجھ گئی،

"میں ابھی آیا" وہ بولا۔ اور باہر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد مسز سکوڈا نے دروازے پر سے کہا: "مے آئی؟"

"آیئے، آیئے" میں نے تعظیماً اٹھ کر کہا: "تشریف رکھئے۔"

وہ بولیں: "سنا ہے آپ جارجٹ لائے ہیں بازار سے؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔ یہ رکھی ہے۔"

بولیں: "کتنا پیارا رنگ ہے اس کا۔ آپ کا انتخاب لاجواب ہے، واہ۔ —— واہ واہ" انہوں نے کپڑا کھول کر اپنے سامنے تان لیا۔ "کے گز ہے؟"

"پانچ گز" میں نے کہا۔

"خوب۔ انہوں نے کپڑے کو تہ کیا اور بولیں: "مجھے بھی ڈورا کے لئے خریدنی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کپڑا نمونے کے طور پر لے جاؤں، کل ہی واپس کر دوں گی۔"

میں نے کہا: "ضرور لے جایئے، پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

وہ کپڑا لے کر چلی گئیں اور میں سو گیا۔

آج صبح میں اٹھا تو مسز سکوڈا کے ہاں بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ فرنیچر ادھر سے ادھر گھسیٹا جا رہا ہے، برتن بج رہے ہیں۔ ڈورا چہک رہی ہے اور رابرٹ اسے

سامان کی سجاوٹ کے سلسلے میں ڈانٹ رہا ہے، میں نے بہت دنوں کے بعد آج اس جھری میں سے دیکھا، ڈورا اسی قدیم لباس میں کھڑی تصویروں پر سے گرد جھاڑ رہی تھی اس کے سر پر بہت سے کلپ چمک رہے تھے - اور رابرٹ صرف ایک نیکر پہنے صوفے کو ایک نئے زاویے پر رکھ رہا تھا، مسز سکوڈ نمائب تھیں یا جھری کے فوکس میں نہ آ سکیں،

اس ہنگامے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، میں نے کپڑے بدل کر ہوٹل اور دفتر جانے کی ٹھانی فلیٹ کو مقفل کر کے میں باہر آیا تو ادھر سے رابرٹ نکلا اور بولا" آج ڈورا کی بائیسویں سالگرہ ہے، ممی معافی مانگ رہی ہیں کہ ہم آپ کو مدعو نہیں کر رہے، ہمارے ہاں چند ایسے بزرگ آ رہے ہیں جو کسی غیر مذہب کے آدمی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے، خاص طور سے گھریلو قسم کی دعوت کے موقع پر، نہایت بے وقوفی کی بات ہے لیکن بڑی مجبوری ہے، امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے"!

مجھے رابرٹ کی یہ صاف گوئی بہت بھلی معلوم ہوئی، خوش ہو کر میں نے کہا" ایسے بزرگ ہر مذہب میں ہوتے ہیں، جو اپنے مذہب سے باہر کے سب انسانوں کو گدھا سمجھتے ہیں، لیکن میں ڈورا کی سالگرہ میں جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر ضرور شریک ہوں گا، اور مسز سکوڈا سے کہہ دیجئے کہ میرے تحفے کو تو ان کا کوئی بزرگ نہیں روک سکے گا۔ ہاں!"

ہم دونوں خوب ہنسے، ڈورا شاید مارے جھینپ کے باہر نہ آئی، اور مسز سکوڈا تو خیر غائب تھیں ہی،

میں شام کے بعد تک بازار میں ڈورا کے لئے تحفہ تلاش کرتا رہا۔ مگر جس تحفے پر میری نگاہِ انتخاب پڑتی اس کے پہلو میں ایک اور چیز ایسی رکھی ہوتی تھی جو میرے منتخب تحفے کی اہمیت کو کم کر دیتی، آخر میں اس خیال سے واپس چلا آیا کہ کل ڈورا کو نہیں تو رابرٹ یا مسز سکوڈا کو بازار ساتھ لے آؤں گا۔ اور وہ اپنی پسند کی چیز خرید لیں گے۔

میں کافی دیر کے بعد اپنی بلڈنگ میں آیا۔ مسز سکوڈا کے فلیٹ کا دروازہ بھڑا ہوا تھا مگر اندر سے قہقہوں، مسرت بھری چیخوں اور کانٹوں چمچوں اور پلیٹوں کے بجنے کی آوازوں کا ایک سیلاب باہر امڈا پڑتا تھا۔ میں نے چپکے سے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو یہ آوازیں ایک دم بہت بلند ہو گئیں، روشنی جلائے بغیر میں سیدھا جھری کے پاس گیا۔ میں ڈورا کو اس کی سالگرہ کے ٹھاٹ میں دیکھنا چاہتا تھا سب سے پہلے میری نگاہ اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہنے والے ایک فرم کے ہیڈ کلرک پر پڑی، جو ایک ڈھیلا ڈھالا ڈنر سوٹ پہنے مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ اور وہ مسلمان تھا!

میں جھری پر سے ہٹ آیا۔ رابرٹ اور مسز سکوڈا اور ڈورا تک سے مجھے انتہا درجے کی نفرت ہو گئی، جی میں آئی کہ یہیں سے چلا کر انہیں اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کر دوں، مگر نفرت کے اس اعلان سے پہلے میں ایک بار ڈورا کو دیکھنا چاہتا تھا۔

میں پھر جھری پر آ گیا۔ ڈورا میز کے سرے پہ کھڑی مسکرا رہی تھی، اور مجھے ایک ذرا سی گھڑی آ گئی۔ جانتے ہو کیوں؟ سنو،

ڈورا نے جارجٹ کے اسی کپڑے کی ساڑھی پہن رکھی تھی جسے مسز سکوڈا اتوار کے لنچ پر مجھ سے مانگ لے گئی تھیں۔ اور وہ اس ساڑھی میں اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ـــــ خیر چھوڑو اس بات کو۔

یہ جو میرا رنگ ذرا اڑا اڑا سا لگ رہا ہے نا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں بیمار ہوں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے مسز سکوڈا کو اس مضمون کی ایک چٹ لکھ بھیجی ہے کہ جارجٹ کے اسی ٹکڑے کو میرا تحفہ سمجھ لیا جائے۔

اور جو بات میں ابھی تک سوچ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ڈورا سے محبت کروں یا اس پر ترس کھاؤں۔

سناٹا

ڈھاکے میں وہ عشق کرنے کی بجائے عشقیہ ناول پڑھتی تھی۔ مگر آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی وہاں سے کچھ اس طرح دامن بچا کر بھاگنا پڑا کہ ان ناولوں کے ساتھ غزلوں کے وہ منتخب اشعار بھی وہیں رہ گئے۔ جنہیں وہ سونے سے پہلے گنگنانے کی عادی تھی۔

گنگناتی تو وہ اب بھی تھی مگر یہ گنگناہٹ لفظوں سے بے نیاز تھی۔ اور پھر چلتے ہوئے کنوئیں کی روں روں میں صرف رہٹ ہی کا نغمہ تو نہیں ہوتا۔ اس میں بجتے ہوئے بیل کی [illegible] اور گاڑی پر بیٹھے ہوئے کسان کے خیالوں کی چاپ بھی تو شامل ہوتی ہے۔ سو کلثوم کی یہ گنگناہٹ محض گنگناہٹ نہ تھی اس میں اس کے شباب کی تھکن اور اس کے جذبات کی اچٹتی نیندوں کی پکار بھی تو شامل تھی۔

اب اس میں نئے ناول اور غزلوں کے نئے انتخاب خریدنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ دن انبالے ہی میں رہ گئے تھے جب بڑی جان

ہر مہینے کی پہلی کو کرایوں کا روپیہ ہاتھ میں لئے مسکراتے ہوئے آتے [illegible]
کی وہ ہماری غذا اور بہن جیسے چند روپے [illegible] کی جیبیں [illegible]
کلثوم نانی کو میز پہ پنج کر تیزی سے اٹھتی اور بھائی جان نے جھٹ جا کر [illegible]
کی پہلے سے تیار کی ہوئی فہرست ان کے سپرد کر دی تھی [illegible]
رہتی۔ اور جب نانی کا ایک [illegible] پلنگ جاتا تو وہ چند روز کے لئے تو
کھانا پینا اور سونا تک بھول جاتی۔ نانی کی [illegible] کے ساتھ [illegible]
طلسمات میں بھٹکتی رہتی۔ گرم گرم [illegible] سے [illegible]
ہوتا۔ ہونٹوں پر آبلے پڑ جاتے۔ [illegible]
جب وہ اندھیری رات کے سناٹے میں بچوں کے [illegible]
محبوب کی گود میں [illegible]
میں انگلی رکھ کر [illegible] کہ اس کے جسم کا سارا لہو اس کے چہرے
میں جمع ہو جاتا۔ اور پھر اس کی بانہیں ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح پلنگ کی پٹی پر سے لٹکنے
لگتیں اور وہ آنکھیں بند کر کے بڑے کرب اور بڑی سرشاری سے کہتی: ہائے
میں مر گئی!

لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

پڑھے ہوئے نرخ کے مطابق دو روپے لے کر رخصت ہو گئے تو جب جا کر کلثوم کی امی کو پتہ چلا کہ سہرے بندھ بندھا کر کھل بھی چکے اور مسمات ناجواب بیگم نجمہ ارشاد احمد کا روپ اختیار کر کے ان کے پاؤں چھونے آئی ہے، اماں نے تو آنکھیں پھاڑ کر "اللہ الصمد!" کہا، اور بے ہوشی پر قابو پانے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگیں لیکن چاروں بہنوں نے حیرت کے لمحاتی سکوت کے بعد ایک دوسرے کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔ "کاش یہاں کہیں ذرا سی مہندی مل جاتی تو بھابی کے ہاتھوں میں رچاتے اور گیت گاتے اور ذرا سا ناچ بھی لیتے۔" کلثوم نے سوچا تھا اور سوچ کر کہہ بھی دیا تھا۔ مگر باقی تینوں بہنیں دھول کی دنیا میں حنا کی تلاش کے خیال تک سے جھکرا گئیں اور بس اتنا کر پائیں کہ نجمہ ارشاد احمد کی خاطر اپنا ایک ایک پل کا آرام حرام کر ڈالا۔

لاہور میں چند ہفتے بھٹکنے کے بعد انہیں ایک محلے میں گھر الاٹ ہو گیا۔ مہینوں کے بعد انہیں اپنے گھر کی دیواروں کا سایہ میسر آیا تھا۔ صحن میں قدم رکھتے ہی برقعے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے اور دیواروں سے لگ کر پاؤں پسار دیئے۔ کچھ دیر اپنا لے والے گھر کی یاد میں روئیں پھر جب اٹھیں تو معلوم ہوا کہ نجمہ ارشاد احمد نے ایک کمرے کو چھوڑ کر باقی سارے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس کا کہنا ہے کہ رانڈوں اور کنواریوں کے پاس ایک سے زیادہ کمرہ ہو تو سمجھ لو کہ دوسرا کمرہ گلچھرے اڑانے کا اڈہ ہے۔ کھلے مکان تو بیاہتا عورتوں ہی کو زیب دیتے ہیں! منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔

چند روز کے بعد نجمہ ارشاد احمد نے سب کا راشن مقرر کر دیا۔ تو ماں بیٹوں میں کھسر پھسر ہوئی اور پھر دیر تک آنسو بہائے جاتے رہے، نجمہ نے ادھر سے گزرتے ہوئے رقت کا یہ طوفان دیکھا تو اپنے کمرے میں جا کر "اک بنگلہ بنے نیارا" کا ریکارڈ لگا دیا۔ تلووں میں بھڑک کر چوٹی میں جا بجھی مگر زبانیں نہ ہل سکیں۔

اور پھر بیگم نجمہ ارشاد احمد نے ایک اور روپ بدلا۔ لگائی بجھائی کا دھندا شروع کر دیا۔ ایک روز منہ پھاڑ کر کہہ ڈالا کہ کلثوم کل دروازے سے لگی سامنے ...... ملائی والے کو پٹر پٹر آنکھیں مار رہی تھی ـــــ" اور جب میں نے ٹوکا تو بولی: "یہ بات نہیں بھابی، میری آنکھ میں پلک گر گئی ہے۔" اب یہ تو قیامت کے دن جا کر معلوم ہو گا کہ پلک گری تھی کہ بے حیائی کود رہی تھی۔"

کلثوم اس وقت دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، یہ سنا تو دیوار کو یوں پکڑا جیسے اینٹوں میں انگلیاں گاڑ دے گی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نجمہ کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم رو دی۔ اور زمین پر یوں ڈھیر ہو گئی جیسے اب تک صرف ایک دھاگے کے سہارے لٹک رہی تھی۔ اور ابھی کلثوم کی ہچکیاں اور قسمیں نہیں تھمی تھیں جب چند روز بعد نجمہ نے ایک اور شوشہ چھوڑا۔ اب کے اس نے کلثوم سے چھوٹی زہرہ کو تاکا۔ ہوائی اڑائی کہ زہرہ اوپر چھت پر بیت الخلا میں جانے کا بہانہ کر کے سب کپڑے اتار ڈالتی ہے اور ایک چپہ بھر لنگوٹ باندھ کر پہلوانوں کی طرح ڈنٹر پیلتی ہے اور بیٹھکیں لگاتی ہے ـــــ" اور میں نے جو اسے ٹوکا تو بولی: "ننگے ہیں تو ہم ننگے ہیں نا۔ تمہیں حیا آ رہی ہے تو چھت پر برقع اوڑھ کر آیا کرو" ـــــ لفنگی کہیں کی ـــ واہیات!"

کلثوم کی اماں نے یہ سنا تو سر پہ ہاتھ رکھ کر یوں چلائی جیسے اس کی اولاد میں سے کسی نے اچانک بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا ہے۔ ارشاد احمد تو ابھی کلثوم ہی کے معاملے میں سوچ بچار کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ زہرہ کی پہلوانی کا تو یہ سنا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لپک کر آیا اور تڑ سے ایک چانٹا زہرہ کے رسید کر دیا۔ اماں کو طیش آ گیا۔ تن کر بیٹے کے سامنے آ گئیں اور ڈپٹ کر بولیں "شرم نہیں آتی؟"

اور ابھی ارشاد احمد کچھ کہنے ہی نہیں پایا تھا کہ نجمہ ارشاد احمد دور سے بولی "نہیں نہیں۔ یہ تو بے شرم ہے، بے حیا ہے، اوباش ہے۔ غنڈہ ہے۔" قریب آ کر چلائی "تم لوگوں کو کھلائے ٹھنسائے بھی یہی بدمعاش، اوڑھے پہنائے بھی یہی آوارہ، اور اوپر سے بے شرمی کی ڈانٹ بھی کھاتا رہے۔" اب وہ اماں کے بالکل سامنے آ گئی اور یوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر باتیں کرنے لگی جیسے بس نہیں چل رہا ورنہ پوروں کو بڑھیا کی آنکھوں میں ٹھونس دیتی "شرم اسے کیوں آئے؟ شرم آئے تجھے اور تیری ان صاحبزادیوں کو جنہوں نے کمر کا کپڑا کھول کر سر پہ باندھ لیا ہے۔ شرم آئے تم سب نیم کچوڑوں کو، اس کے دشمن شرمائیں!" پھر وہ ارشاد احمد کے قدموں میں بیٹھ کر زار زار رونے لگی "پر مجھ جنم جنم کی بدنصیب کو کس حاذق نے بتایا تھا کہ ماں بیٹے کے بیچ میں ٹانگ اڑاؤں۔ بھئی مجھے بخش دو تم سب لوگ۔ اب میں تم لوگوں کے بیچ میں بولوں تو کمینی ہو کر مروں۔ کتنے میرے مردے کا منہ چاٹیں۔"

ارشاد احمد نے ایک جھٹکے سے نجمہ کو اٹھایا اور اسے ایک کمرے میں پہنچا کر واپس آیا۔ کلثوم سے بڑی رضیہ جو ایک عرصے سے نیم پاگل تھی اور جسے چاند

کی ابتدائی اور آخری تاریخوں میں مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ آئی اور اماں کے سامنے یوں باہیں پھیلا کر کھڑی ہوگئی جیسے ڈھال بن کر انہیں بیٹے کے حملے سے بچا رہی ہے، رضیہ سے بڑی فرخ اپنی بیوگی کا سہارا دیتی بھاگی آئی۔ اس کے پیچھے اس کے دونوں بیٹے بھی بلبلاتے ہوئے دوڑے اور موقع پاکر ماں کی ٹانگوں سے زنجیر بن کر لپٹ گئے، زہرہ اور کلثوم روتے روتے اس زور کی ہچکیاں لے رہی تھیں جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ بار بار ان کی ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہے۔

ارشاد احمد نے رضیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "نہیں اماں مجھے تو ذرا سی بھی شرم نہیں آتی جس گھر میں لڑکیاں آنکھیں ماریں اور ننگی ہو کر ڈنٹر پیلیں وہاں ایک لڑکے کو بھلا شرم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سمجھیں آپ؟"

ماں نے آنسو پونچھ کر بیٹے کو نرمی سے سمجھانا چاہا مگر بیٹا تو جیسے ماں کے سوال کا جواب ہی دینے آیا تھا۔ فوراً واپس چلا گیا۔ شام کے بعد اماں نے اسے الگ لے جا کر سمجھایا کہ "بیٹا، یہ تیری بیوی ہے نا۔ یہ ہمارے سارے گھر میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہے۔ اور دیکھو بیٹا۔ ذات کی کمینی معلوم ہوتی ہے ورنہ یوں ماں بیٹے اور بھائی بہنوں میں ———"

مگر ارشاد احمد کے تیور پہلے ہی سے بدل چکے تھے، اس نے ماں سے صرف اتنا کہا "ابھی کوئی خاص فکر کی بات نہیں امی۔ مجھ بے شرم نے اس کمینی کے لئے ایک الگ مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔"

ماں روتی چلاتی رہی۔ پھر واپس آ کر بیٹیوں کو بتایا تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ رضیہ دھڑام سے گری اور پاؤں تشنج سے کر منہ سے جھاگ نکالنے لگی۔ ساری رات اسی افراتفری میں گزری، اور صبح کو پتہ چلا کہ ارشاد احمد اور بیگم نجمہ ارشاد احمد رات ہی رات کسی دوست کے ہاں اٹھ گئے ہیں۔

انبالے سے لاہور آنے پر کلثوم کے خوابوں کے آبگینے میں صرف بال آیا تھا۔ بھائی جان کے جاتے ہی یہ آبگینہ ایک چھناکے سے ٹوٹا۔ اور کرچیاں بن کر اس کے ذہن کو کاٹنے لگا۔ یہ کرچیاں زندگی کی وہ سفاک حقیقتیں تھیں جنہوں نے کلثوم کو ناولوں کے طلسمات بھرے دھندلکوں سے نکال کر ایک گرلز ہائی اسکول میں لا ڈالا۔ زندگی گھر سے اسکول جاتی ہوئی ایک گلی میں سمٹ کر اونگھنے لگی اور ناولوں کے خاکے اور غزلوں کے منتخب اشعار تختۂ سیاہ پر دو جمع دو چار کے ہندسوں کا روپ اختیار کر گئے۔ چٹخنے اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کا یہ ملبہ اس کے چہرے پر بھی نمودار ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کچھ ایسی حسین نہیں تھی۔ لیکن جوانی سب سے بڑا حسن ہے اور پھر کلثوم کی جوانی تو بڑی باشعور تھی، کلثوم نے تو عشقیہ ناول اور غزلیں پڑھی تھیں اور گھر سے باہر قدم دھرے بغیر وہ مصفا پانی کے جھرنوں کے کنارے چاندنی کے نقرئی غبار میں اپنی طرف لپکتے ہوئے محبوب کی پرچھائیاں دیکھ چکی تھی۔ اور ہونٹوں میں رینگتے ہوئے کسی گرم گرم احساس نے اسے کتنی بار آنکھیں بند کر کے کہیں ڈوبتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب اچانک اس کی آنکھوں کے نیچے سائے کے سے پھیکے پھیکے رنگ کی پھیلی پھیلی تو ہیں ابھر آئی تھیں۔ اور بھوؤں کے بے ترتیب بالوں اور سیاہ حلقوں میں گھری ہوئی اس کی آنکھیں معصوم بچوں

کے جنازے سے بن کر رہ گئی تھیں۔ ناک بالکل ہلدی کی گرہ معلوم ہوتی تھی۔ اور گالوں نے دھنس کر اور ٹھوڑی کی ہڈی نے ابھر کر اس کے چہرے کو مثلث کی سی صورت دے دی تھی۔ ہاتھ چہرے سے زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ البتہ بالوں کا وہی ٹھاٹ تھا۔ وہی لہریں اور وہی ریشم کی سی نرمی۔ ایک بار حسن کے اس بھٹکے ہوئے عنصر کو جوڑے کی صورت میں سمیٹ لینا چاہا۔ آئینہ دیکھا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے سر کے پیچھے ایک اور سر اُگ آیا ہے۔ مسکرا کر اس نے بالوں کو پھر پیٹھ پر بکھیر دیا۔ اس مسکراہٹ میں بجھتی ہوئی چنگاریوں کی سی چمک بھی تھی اور زردی بھی۔ "ہائے ری یہ اجاڑ زندگی!"۔ اس نے گالوں کے گڑھے میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر کھاٹ پر گر کر دوسرے دن کے سبق کی تیاری کرنے لگی تھی۔

ارشاد احمد دوست کے ہاں سے گورنمنٹ کوارٹروں میں منتقل ہو گیا اور اس کے بعد پتہ چلا کہ وہ تبدیل ہو کر جھنگ پہنچ چکا ہے۔ اس نے گھر میں خط تک نہ لکھا۔ بھائی جان کو یاد کر کے بہنیں روتیں تو اماں کچھ دیر تک ان کا ساتھ دیتیں اور پھر اچانک سنبھل بیٹھتیں۔ آنسو پونچھ کر کلثوم کو سینے سے لگا لیتیں اور کہتیں "جب تک میری یہ شیر بیٹی موجود ہے۔ مجھے دنیا میں کسی کی پروا نہیں، اری میری کلثوم بیٹا۔ تو تو میری مرد بیٹی ہے۔ تو نے تو ارشاد کی ساری کمیاں پوری کر دیں!"

اور کلثوم یوں محسوس کرتی جیسے اس کے ڈاڑھی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ اس کی آواز میں مردانہ پن آ گیا ہے۔ اور اس کی پیٹھ پر پڑے ہوئے بالوں کا ڈھیر جھڑ گیا ہے۔ وہ ہر مہینے کی یکم کو اسی روپے لا کر ماں کے سامنے رکھ دیتی

اور تنہائی میں جاکر خوب روتی ۔ آنے والا مہینہ اپنے خشک اکڑے ہوئے چیونٹوں کے سے ہندسوں کا ایک ٹوکرا اس کے سر پر دے مارتا۔ یہ چیونٹے اس کے لہو میں سرسرانے لگتے اور وہ اپنے گرد آلود ذہن کی گہرائی میں سے دھول سے اٹا ہوا ایک شعر نکال کر گنگنائی ؎

اب بھی اک عمر میں جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا

ردیف کا صیغۂ تذکیر کلثوم کو اپنی اماں کا قول یاد دلا دیتا۔ "تو تو میری مرد بیٹی ہے بیٹا!" — اور وہ آنسو پونچھ کر صحن میں آجاتی ۔

وہ دیکھتی کہ اماں اور فرخ باجی بازار جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں تاکہ مہینے بھر کے خرچ کے لیے لکڑی، اُپلے، ذرا سا گھی، تیل، دالیں اور نمک مرچ بھر دا لیں۔ رضیہ آپا فرخ باجی کے بیٹوں نذر اور نذیر کے سر میں سے جوئیں نکال رہی ہیں اور انہیں اس پہلوان کی کہانی سنا رہی ہیں جسے جوؤں نے چاٹ چاٹ کر بودا بنا دیا تھا۔ زہرہ اکنی کا آسمانی رنگ خریدنے کی فرمائش کر رہی تھی ۔ اور بکرے کا آدھ سیر گوشت منگوایا جا چکا تھا ۔ زندگی کی یہ کتنی معصوم بے چینیاں ہیں۔ کلثوم نے سوچا، بالکل ایک ننھے بچے کی اطمینان بھری بے چینیاں، جو ماں کے دودھ سے سیر ہو کر ٹانگوں کی چرخی چلاتا ہے ۔ ہاتھ ہلاتا ہے، آنکھیں گھماتا ہے، اور مسکرا دیتا ہے، اس ننھی سی دنیا کی یہ جلیت پھرت کلثوم کے دل کو عزم و جرأت کی تازگی بخشتی ۔ مگر جب پندرہ تاریخ کے بعد اچانک ہر چیز کی کمی کے بھوت ذہنوں پر سوار ہو جاتے اور بیٹیاں ماں سے، اور بہنیں بہنوں سے جھگڑتیں اور ٹسوے

بہاتیں اور خالی پیٹ سو جائیں ۔ تو کلثوم ایک بار پھر " زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا " گنگنانے لگتی، اور رضیہ کو نیند میں ہنستا دیکھ کر جی ہی جی میں کہتی " تم مجھ سے ہزار درجے کروڑ درجے اچھی ہو آپا ۔ تمہارا ذہن کند ہو چکا ہے ، تمہاری یادیں گڈمڈ ہیں ۔ تمہارے لئے ہر حقیقت ایک خواب ہے ۔ تم کتنی خوش نصیب ہو رضیہ آپا " ——— پھر جب وہ اپنی چھوٹی بہن زہرہ کو چراغ کی روشنی میں اسکول کی کتاب رٹتے دیکھتی تو اس کا گلا بھر آتا ۔ کلثوم کو اچانک زہرہ بہت بوڑھی معلوم ہونے لگتی ۔ اور اس کا جھریوں بھرا ہاتھ تختۂ سیاہ پر بڑے ڈراؤنے ہندسے بنانے لگتا ، اور پھر ایک ایکا زہرہ کے ڈاڑھی مونچھیں نکل آتیں ———

سر جھٹک کر کلثوم اٹھ کھڑی ہوتی اور زہرہ کے پاس جا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ۔ " سو جاؤ میری زہرو رانی ۔ اب سو جاؤ ۔ اتنا زیادہ پڑھو گی تو آنکھوں میں دھول اڑنے لگے گی ۔ اور یہ تم نے بالوں میں کب سے تیل نہیں ڈالا بے وقوف " زہرہ مارے پیار کے اس سے لپٹ جاتی ۔ نذر اور نذیر نیند میں بڑبڑاتے اور فرخ آپا آیۃ الکرسی پڑھ کر انہیں دم کرتیں اور پھر کہتیں " اب سو جاؤ زہرہ ۔ اور کلثوم، تم کیوں کھڑی ہو یہاں ۔ سوتی کیوں نہیں ؟ اری لڑکیو ، تمہاری صحتیں بگڑ گئیں تو ہم سب کیا کریں گے ، کبھی یہ بھی سوچا ہے ؟ "

مگر یہ سوچنے کی فرصت ہی کسے تھی ۔ زہرہ اپنی پڑھائی میں مگن تھی اور کلثوم کے ذہن میں آندھیاں بڑے زناٹے سے چل رہی تھیں ——— اور وہ کہرول اور بندسوں کے تصادم کے درمیان پسی جا رہی تھی جب اچانک جیسے آسمان کا ایک دریچہ کھل گیا ۔ اور اس پر ست رنگا مینہ برس پڑا ۔ اسے اسکول کے

ایک کلرک جمال الدین کی چٹھی ملی جس کا مضمون صرف ایک بار پڑھنے ہی سے کلثوم کو ازبر ہو گیا تھا۔ لکھا تھا "میری بڑی ہی پیاری کلثوم۔ جب سے تم اس اسکول میں آئی ہو، میری زندگی کے مشرق پر طلوعِ سحر کا سا اجالا نمودار ہو چکا ہے۔ تمہاری معصوم صورت میری آنکھوں، میرے دل، میرے سارے پیکر میں رچ بس چکی ہے۔ اور اب عالم یہ ہے کہ میں سو تک نہیں سکتا۔ سوچ تک نہیں سکتا۔ رو تک نہیں سکتا۔ سکتے کا سا عالم ہے۔ پو پھٹے کے اس سناٹے میں کوئی پنچھی بھی تو نہیں اڑتا کہ میں تمہارے خوابوں سے چونکوں۔ اب تک طلوعِ آفتاب کا انتظار کیا۔ آنکھیں سفید ہونے لگیں تو ایک بھکاری بن کر تمہارا در کھٹکھٹانے آیا ہوں، تم نے توجہ کی تو یوں سمجھوں گا کہ میری جاگتی راتوں کی ریاضت قبول ہوئی۔ اور اگر تم نے میرا یہ عریضہ ہیڈ مسٹرس صاحبہ کو دکھا دیا تو پھر ہر چہ بادا باد کسی شاعر کا یہ شعر گنگنا لوں گا ؎

شرکتِ غیر سے محفوظ ہے یہ ربطِ لطیف
تیری نفرت میں ہے جو بات، محبت میں نہیں

خط پڑھنے کے بعد کلثوم کو آناً فاناً عشق ہو گیا۔ بلکہ اس نے تو یوں محسوس کیا جیسے وہ تو ایک عمر سے جمال پر فدا ہے، جیسے وہ اسے بڑی اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہے اس کے چہرے کا رنگ ذرا سا خاکستری تھا تو کیا ہوا۔ اور اس کی آنکھیں کبھی کبھی ہڈی کے بٹن بن جاتی تھیں تو ہرج ہی کیا تھا۔ وہ نوجوان تو تھا اور نوجوانی سے بڑی خلوص کی ضمانت اور کیا ہو گی۔ "میرا جمال!" اس نے زیرِ لب کہا "میرا" اپنائیت اور ملکیت کے اس

احساس نے اس کے چہرے کی مثلث میں گولائی پیدا کر دی۔ اسے اپنے اندر کوئی چیز پھیلتی سی محسوس ہوئی اور جسم کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا۔ اور اسے کچھ ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سامنے نئے نئے عشقیہ ناولوں کا ایک ڈھیر سا لگا دیا ہے اور وہ دریچوں، چلمنوں اور سیڑھیوں کے اندھیروں میں سے گزر کر کاغان کی وادیوں میں نکل گئی ہے!

"نہیں نہیں جمال۔ مجھے چھوڑ دو مت" اس نے چند روز بعد کہا تھا۔ اس وقت وہ اسکول کے باغیچے کے اس گوشے میں کھڑی تھی جہاں چنبیلی کے جھاڑ سے اگ رہے تھے اور سفیدے کا ایک تنہا درخت جیسے ان پر پہرہ دار بن کر کھڑا تھا۔ جمال کے چہرے کا خاکستری رنگ چمک رہا تھا۔ اور آنکھوں کے بٹن دہک اٹھے تھے۔ اس نے کلثوم کو اپنی باہوں میں لینا چاہا تھا مگر وہ پیچھے ہٹ کر چنبیلی کے جھاڑ میں ڈوب سی گئی تھی "نہیں جمال۔ یہ بری بات ہے"۔ —— پھر جب گھر واپس آکر اس نے گھنٹوں کے سوچ بچار کے بعد فرخ باجی سے سارا قصہ کہہ سنایا تو باجی کے ہونٹ کچھ یوں کانپے جیسے جمال نے انہی کو باہوں میں بھینچ لینے کا قصد کیا تھا۔ شرما گئیں، پھر مسکرانے لگیں اور کلثوم کو ٹھوڑی سے ذرا سا ہلا کر باہر بھاگ گئیں۔ شاید جاتے ہی انہوں نے اماں سے ذکر کر دیا۔ کیونکہ اماں اٹھیں۔ کمرے میں آکر کلثوم کو پکڑا۔ بلکہ جکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی چولھے کے پاس جا بیٹھیں "ہوں!" انہوں نے اپنی آٹے بھری انگلی کو ناک پر رکھتے ہوئے کہا "شادی کا بھوت سوار ہوا ہے؟ کبھی اپنی صورت بھی دیکھی ہے آئینے میں، ہوں؟ دیکھی ہے؟ یہ پھٹی پھٹی آنکھیں اور یہ مردہ مردہ ہونٹ اور یہ

چھاج سے کان —— جاؤ، ذرا آئینہ دیکھ کر آؤ اور پھر مجھ سے بات کرو۔ اری وہ لفنگا تو تجھے دو چار دن استعمال کر کے پھٹے جوتے کی طرح کوڑے پر ڈال دے گا۔ مجھ سے پوچھو ان مردوں کے چلن۔ تم نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے۔ اور پھر تم کیا جانو وہ کون ہے، میراثی ہے کہ کنجڑا۔ اری تم کیا جانو۔ لڑکیوں کو پڑھا لینی ہو تو کیا ہوا۔ میں پڑھی لکھی ہوتی تو میں بھی پڑھا لیتی، مردوں نے تجھے پڑھایا تو ساری نارسیاں بھول جاؤ گی۔ اور تم فرخ۔ تم کیسی بتیسی نکالے بھاگی آئیں جیسے کلثوم کے لئے آسمان پر سے فرشتہ اترا ہے۔ سن لو کان کھول کر، جب تک میں اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ نہیں لوں گی امیدوار صاحب کو تو نہ کلثوم کی شادی ہو گی نہ زہرہ کی۔ اور پھر عاشقوں کی شادی! صابن کے جھاگ کو میں تو مر کر بھی اسفنج نہ کہوں۔ ٹائیں ٹائیں فش ایسی ہی شادیوں پر تو بولا جاتا ہے۔ اور رضیہ، تم کیا سننے آئی ہو؟ جاؤ، سب جاؤ۔ اور دیکھو پھر ایسی بات اس گھر میں نہ ہونے پائے۔ کوئی مرد نہیں ہے گھر میں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شرم کو اٹھا کر طاق پر رکھ دو۔ جاؤ!"

کلثوم واپس آ کر اپنی کھاٹ پر گر پڑی اور دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر خوب خوب روئی، زہرہ تو خیر اوپر چھت پر بیٹھی اپنی کتابیں پڑھ رہی تھی، اور اس شور و شغب کی نوعیت کو سمجھے بغیر روز کا معمول سمجھ کر ٹال گئی۔ فرخ کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اماں کی ڈانٹ سے بے نیاز ہو کر اسے تسلی دینے آئے، البتہ رضیہ نے اسے یوں ڈھیر دیکھا تو بھاگ کر آئی اور اس سے لپٹ گئی اور اپنی بڑی بڑی گھبرائی گھبرائی سی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں گاڑ کر بولی "دیکھو کلثوم۔ اگر

تم اسی طرح روتی رہیں تو میں اتنا بڑا انگارہ اٹھا کہ نگل جاؤں گی" کلثوم نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ رضیہ آپا سے کچھ دور نہیں تھا کہ وہ غصے میں آ کر سچ مچ انگارہ چبالے۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور پھر دکھاوے کے لئے مسکرا بھی دی۔ اس مسکراہٹ میں چمک تو تھی مگر یہ جلتے ہوئے گھروندے کی سی چمک تھی۔ رضیہ کی آسیبی آنکھیں بھی اس چمک سے خیرہ ہو گئیں۔ وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی۔ اور پھر ٹوٹ کر رو دی۔ اسے روتا دیکھ کر فرخ کو سہارا مل گیا۔ بھاگی آئی، اب ماں بھی ضبط نہ کر سکی۔ نذرو اور نذیرہ بھی اندر آ گئے اور نذرو چھت پر جا کر زہرہ کو بھی بلا لایا۔ اور جب سب لوگ رضیہ کو محض اس خیال سے دلاسا دینے لگے کہ کہیں روتے روتے اس پر مرگی کا دورہ نہ پڑ جائے تو رضیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آنسو پونچھے بغیر ہنستی رہی اور پھر بولی "تم بھی اتی عجیب احمق ہو، اپنی بیٹیوں تک کو نہیں سمجھتیں۔ تم کہو گی یہ آنسو میرے آنسو ہیں۔ مانا آنکھیں میری ہی بھیگی ہیں پر یہ آنسو میرے آنسو نہیں۔ یہ تو میری پگلو کلثوم کے آنسو ہیں۔ میں نے اس سے مانگے اس نے دے دیئے۔ بس۔ میں تھوڑی رو رہی ہوں!"۔ وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی اور پھر دھڑام سے ماتھے کے بل زمین پر گری اور پاؤں پٹختے ہوئے منہ سے جھاگ نکالنے لگی۔ نذرو اور نذیرہ ڈر کر باہر بھاگ گئے، زہرہ کونے میں منہ دے کر رونے لگی، کلثوم اور فرخ نے رضیہ کے اینٹھتے ہوئے ہاتھ پاؤں جکڑ لئے اور اماں اونچے اونچے آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں جب بہت دیر کے بعد رضیہ کو ہوش آیا تو وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ فرخ اور کلثوم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ تو اس نے اپنا دبلا ہاتھ کلثوم کی آنکھوں پر ملا

اور لالٹین کی روشنی میں اپنی انگلیوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر بڑے غصے سے بولی "دیکھو کلثو۔ اب تمہاری جگہ میں روؤں گی تم نہیں روؤ گی سمجھیں؟ ورنہ تمہارے سامنے آکر انگارہ نگل لوں گی"۔۔۔ کلثوم لرز گئی۔ بولی "میں اب بہت کم روؤں گی آپا"۔۔۔ رضیہ خوش ہو کر بولی "تم نے مجھے اپنے آنسو دیے، میں اپنی ہنسی تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟"۔۔۔ "ٹھیک" کلثوم نے مارے ڈر کے فوراً سودا کر لیا۔ اور جب لوگ اس کے کمرے میں سے چلے گئے تو چٹکنی لگا کر بے تحاشہ رونے لگی۔

دیر تک رونے کے بعد وہ اچانک بھڑک کر اٹھی۔ اور لپک کر بکس پر سے آئینہ اٹھا لیا۔ آئینے کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو گھورنے لگی۔ پھر اس کے ماتھے پر شکنیں پیدا ہوئیں۔ چہرے پر کراہیت کے سائے چھا گئے۔ اور اس نے ہونٹوں کے کچھ ایسے زاویے بنائے جیسے آئینے پر تھوک دینا چاہتی ہے۔ آئینے کو ایک طرف پھینک کر وہ کھاٹ کی طرف مڑی۔ مگر پھر ایک دم پلٹی اور آئینے کو اٹھا کر اس کا جائزہ لیا کہ کہیں ٹوٹ تو نہیں گیا۔ آئینے کو آہستہ سے بکس پر رکھ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ اٹھایا اور پنسل سے لکھنے لگی۔ یہ جمال کے نام خط تھا۔ اس نے لکھا "آپ نے مجھے بہت بلندی سے پکارا ہے، اور میں ایورسٹ کی چوٹی پر نہیں چڑھ سکتی، مجھے دوبارہ پکارنا بیکار ہے ورنہ آپ کی آواز کی گونج ہیڈ مسٹرس صاحبہ بھی سن لیں گی"۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے آخری فقرہ کاٹ دیا۔ پھر ساری عبارت کاٹ دی۔ دوٹوک انداز میں لکھ دیا کہ میں مجبور ہوں۔ چٹ کو تکیے تلے رکھ کر چٹکنی کھولی

اور بڑی کراری آواز میں پکاری ۔" کھانا تیار ہے امی، آؤں ؟"

اماں اور فرخ چولھے کے پاس بیٹھی شاید رو رہی تھیں ۔ بھڑک کر کھڑی ہو گئیں جیسے چاند کا انتظار ہو اور ایک دم سورج نکل آئے ، وقفے کے بعد اماں کی ذرا سی بدلی ہوئی آواز آئی ۔" تم کیوں آؤ بیٹا ۔ میں خود لا رہی ہوں ۔ میں آج اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلاؤں گی تمہیں ، وہیں بیٹھو ۔"

فرخ بولی ۔" تم کہو تو نذر بازار سے ذرا سی ملائی لے آئے ۔"

" کیوں نہ لائے " اماں بولیں ۔" پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ، جاؤ نذر میاں ، لپک کر دو آنی کی ملائی لے آؤ ، اور دیکھو ، کہنا ذرا سی پستے کی ہوائیاں بھی چھوڑ دے زیادہ پیسے مانگے تو کہنا ہم تو پرانے گاہک ہیں ، ابھی پچھلے مہینے بھی تو دو آنی کی ملائی خریدی تھی تمہی سے ــــ جاؤ ۔"

کلثوم خاموش کھڑی مسکراتی رہی ۔ پھر ٹہلتی ہوئی دوسرے بڑے کمرے میں چلی گئی ۔ چراغ کی روشنی میں سوتی ہوئی رضیہ کا چہرہ لاش کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا ۔ اور اس کے ہونٹ کچھ یوں نیم وا تھے جیسے اس کی روح نے بس ابھی ابھی پرواز کی ہے ۔" آپا " وہ پکاری ۔ اور پھر اپنے ہونٹ نوچ لئے ، جیسے رضیہ آپا کی بخشی ہوئی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں سے نچوڑ لینا چاہتی ہے ۔ رضیہ نے ایک لمبی سانس لے کر کروٹ بدل لی تو کلثوم ایک بار پھر مسکرا دی ۔ آپا تو زندہ ہیں اس نے سوچا ۔ مرگی کے بعد ہمیشہ اس طرح گھوڑے بیچ کر سوتی ہیں ۔

کلثوم وہاں سے دبے پاؤں زہرہ کے کمرے میں چلی گئی ، وہ کھلی کتاب کو سینے پر رکھے سو رہی تھی ۔" سو رہی ہو زہرہ ؟"

"نہیں تو" زہرہ اٹھ بیٹھی "سو تو نہیں رہی تھی۔ رو رہی تھی"۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور کلثوم کی ٹانگوں سے لپٹ کر، بھرائی ہوئی آواز اور ٹوٹے ہوئے فقروں میں بولنے لگی "آپ سمجھتی ہیں بچی ہوں۔ یہ نہیں اپی۔ میں نادان نہیں ہوں۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ کسی اور گھر میں چلی جائیں گی۔ اور پھر مہینوں بعد کبھی کبھی ہمارے یہاں آئیں گی اور یوں ہی بس ذرا سا مزاج پوچھ کر چلی جائیں گی۔ اور آپ کو یہ تک معلوم نہ ہوگا کہ کم بخت زہرہ اسکول کی فیسیں نہ دے سکی اس لئے دسویں جماعت سے آگے نہ بڑھی۔ ہم بھلا آپ کے کون ہیں اپی۔ آپ کو ہم سے کیا"۔ پھر وہ الگ ہٹ کر بڑے غصے سے بولی "جائیے نہیں بولتے آپ سے عمر بھر نہیں بولیں گے۔ جائیے کر لیجئے شادی، ایک چھوڑ دس شادیاں کر لیجئے، جائیے"۔ زہرہ نے کتاب اٹھا کر دیوار پہ دے ماری اور روتی ہوئی ٹوٹی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گئی، اور حواس باختہ کلثوم اس کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ زہرہ یکایک سنجیدہ ہو کر اٹھی۔ زمین پر سے کتاب اٹھائی۔ اسے پلو سے جھاڑا۔ اور پھر اسے کھاٹ پر رکھ کر گنہگار دل کی طرح ڈرتے ڈرتے کلثوم کو دیکھا۔

کلثوم اسے تسلی دینے کے لئے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اماں اور فرخ اندر آگئیں "یہ کیا بکواس ہو رہی ہے زہرہ؟" اماں نے پوچھا۔

"یہ تو سدا کی جھکی ہے" فرخ نے ڈانٹا "آخر تم کلثوم سے چاہتی کیا ہو؟"

"ملائی اموں" نذر دروازے پر سے بولا۔

تینوں بہنیں کھلکھلاکر ہنس پڑیں۔ اماں تک مسکرا دیں اور پھر کلثوم زہرہ کو سینے سے لگاکر اس کے سر پر مسلسل پیار کرنے لگی۔ اماں اور فرخ باہر چلی گئیں تو اسے ہولے سے بتایا کہ ”بات شادی ہونے کی نہیں تھی پگلو۔ شادی نہ ہونے کا ذکر چل رہا تھا۔ تم نے بات نہیں سنی۔ بات کی گرہ نچ سنی۔ میں تو تمہیں ایم۔ اے تک پڑھاؤں گی۔ یہ بھائیوں ہی کے کلیجے ہوتے ہیں کہ بہنوں کو بیچ منجدھار چھوڑ کر خود کنارے جا لگیں۔ بہنیں تو اکٹھی ترتی اور اکٹھی ڈوبتی ہیں۔ بے وقوف“۔ اس نے ایک بار پھر زہرہ کے سر کو چوما اور پھر ہونٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ”ہائے ری تمہاری یہ بال پنیں کم بختیں۔ ایک تو میری ہونٹ میں گھس گئی۔ اُٹین کو بال پنیں تک لگانے کا ڈھب نہیں آتا۔ اِدھر آ“ اس نے مسکرا کر زہرہ کے ہلکے سے چپت ماری۔ الٹی ہوئی بال پن کو درست کیا۔ اور باہر آ کر اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ سیر ہو کر خوب مزے سے سوئی اور صبح کو حسب معمول اسکول چلی گئی۔

چنبیلی کی جھاڑیوں میں جمال اس کا منتظر تھا۔ وہ جب اس کی طرف بڑھی تو جمال کے ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل جانے کے لئے کانپنے لگی۔ پھر ایک دم مسکراہٹ کی یہ کرن اس کی آنکھوں کو چمکاتی اور گالوں کو رنگتی اس کے روئیں روئیں میں دوڑ گئی۔ مگر آج کلثوم کے ہونٹ اس مسکراہٹ سے محروم تھے جسے جمال نے چند روز پہلے طلوعِ سحر کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں نے لوہے کے شکنجے کی طرح اس کے شباب کے سارے تقاضوں کو بڑی قوت سے جکڑ رکھا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں پتھر تھے۔ اور آنکھوں

کے نیچے اس کے گالوں کی ہڈیاں سینگوں کی طرح ابھر آئی تھیں، جمال کے پاس آکر اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کے چہرے پر ایک گھروندا جلنے لگا پھر وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما کر آگے نکل گئی۔ سفیدے کے تنے کی آڑ سے اس نے چنبیلی کی جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ مگر جمال تو جیسے اس کے قدموں پر قدم رکھتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا تھا۔ بولا "میں زہر کھا لوں گا"۔ مگر کلثوم تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اور پھر چند روز بعد جب وہ لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی تو اچانک کھڑکیاں اور روشن دان بج اٹھے۔ بجلی چمکی اور بادل اس زور سے گرجا کہ کھڑکیوں کے شیشے گرج کے بعد بھی جھنجھناتے رہ گئے۔ چڑیوں کا ایک غول روشندانوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے گزر کر کمرے میں گھسنے کے بعد کلثوم کے بالوں کو پیٹھ پر سے اٹھا کر اس کے منہ پر بکھیر کر چلتا بنا۔ لڑکیاں ہنس دیں اور کلثوم قہقہے مارتی ہوئی کرسی پر گر پڑی۔ پھر کھریا مٹی کا ٹکڑا میز پر پھینک کر وہ باہر بھاگی، اسکول کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کی جا رہی تھیں۔ موٹی موٹی بوندیں بھی گرنے لگی تھیں۔ چمک اور گرج کا تواتر ایسا تیز ہو گیا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا آج روشنی کی بارش ہو گی اور کرنوں کی ندیاں بہیں گی۔ ہونٹوں کے گوشوں میں طلوعِ سحر لئے وہ کھیل کے میدان میں آ گئی، بارش نے لباس کو اس کے جسم پر منڈھ دیا تھا مگر ہرا اس لباس کو جگہ جگہ سے جیسے چٹکی سے پکڑ پکڑ کر کھینچتی تھی اور تالیاں سی بجا کر نکل جاتی تھی۔ اور پھر جب وہ چنبیلی کی جھاڑیوں میں پہنچی تو ان جھاڑیوں کے نیچے چنبیلی کے جھڑے ہوئے پھولوں

کا ڈھیر لگا تھا اور ہر بوند کے مس کے ساتھ یہ پھول تڑپ تڑپ اٹھتے تھے۔
اسے کچھ ایسا لگا جیسے یہ سارے پھول اس کے ہاتھوں نے نوچے ہیں اور وہ
کچھ یوں پنجوں کے بل ہو کر چلنے لگی جیسے اگر کوئی پھول اس کے پاؤں تلے
آ گیا تو چیخ اٹھے گا۔ اب بارش بہت زور سے ہونے لگی تھی۔ اور بادل جیسے
سفیدے کے تنہا درخت کی آخری پھننگوں تک جھک آئے تھے۔ وہ
اندھا دھند بارش سے بچنے کے لئے سفیدے کی طرف بھاگی۔ مگر اچانک
جیسے چنبیلی کی جھاڑیاں اس کے قدموں سے لپٹ گئیں۔ سفیدے کے تنے
کے پاس جمال کھڑا تھا۔ اس کی مٹھیوں میں چنبیلی کے پھول تھے اور وہ کہیں
دور دیکھ رہا تھا۔

اور پھر ایک دم جیسے موسم بدل گیا۔ ہوا گرم ہو گئی۔ بوندوں میں سوئیاں
بھر گئیں، بادل رونے لگے اور بجلی دانت کچکچانے لگی۔ کلثوم کے پھیپھڑے
ہوا سے خالی ہو گئے۔ اور پسلیاں ایک دوسرے میں پھنستی معلوم ہوئیں۔ اور
وہ چنبیلی کی جھاڑیوں میں یوں دبک گئی جیسے اس نے جمال کو دیکھ لینے کی
چوری کر لی ہے۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگی اور باہر سڑک پر آ گئی۔ دکانوں
کے چھجوں کی پناہ میں کھڑے ہوئے راہ گیر اسے بھیگے اور چپٹے ہوئے لباس
میں دیکھ کر علی الاعلان محظوظ ہونے لگے۔ پکوڑے تلتے ہوئے دکاندار
نے تیل سے سنی ہوئی مونچھوں کو کندھوں سے پونچھ کر ہانک لگائی "ارے
میں قربان جاؤں۔ رُت ایسی شفاف ہے کہ نظریں آر پار ہوئی جا رہی ہیں۔"
——— عام طور سے وہ اس قسم کی آوازوں کا بڑی سختی سے نوٹس لیتی تھی۔

اور اگرچہ اس نے زبان کبھی نہ کھولی مگر آوازہ کسنے والے کو اتنے غصے سے گھورتی تھی کہ وہ جھینپ کر رہ جاتا تھا۔ مگر آج تو جیسے اسے پکڑے جانے کا خدشہ تھا جسم سے اچٹ اچٹ کر ہوا میں تالیاں بجاتے ہوئے لباس کو سنبھالے بغیر وہ ناچتے اور تڑپتے ہوئے موٹے موٹے بلبلوں سے سجی ہوئی سڑک پر بیکی چلی گئی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ نیم عریاں ہو رہی ہے۔ جلدی سے اس نے اپنی یہ عریانی چھپانے کی کوشش کی اور پھر پنجوں کے بل چلتی اپنے کمرے تک آ گئی۔ دروازہ کھولا تو فرخ کی آواز آئی "کون؟"

"میں باجی" وہ بولی اور غڑاپ سے اندر چلی گئی اور بھیگے ہوئے لباس پر بستر کی چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

فرخ اندر آئی مگر اسے سہمی دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی۔

"باجی" کلثوم نے آہستہ سے کہا "دروازہ بھیڑ دیجئے"

فرخ نے چپ چاپ دروازہ بھیڑ دیا۔

"باجی" وہ بولی۔

فرخ اس کے قریب آگئی،

"باجی" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "نہیں باجی۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں"

فرخ ذہنی طور پر سر کے بل کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر اس نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ آواز سن کر اماں، رضیہ، نذر اور نذیر سب اندر آ گئے،

اور کلثوم نے فوراً رونے کو ہنسی میں بدل لیا۔ چیخ چیخ کر قہقہے لگاتے ہوئے بولی "میری چادر نہ اتارنا آپا۔ میں ننگی ہوں"

"ننگی" سب نے حیرت سے کہا۔ اور نذرا اور نذیر باہر بھاگ گئے۔

"ننگی کیسے؟" اماں نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔ اور کلثوم کے جسم پر سے چادر نوچ لی۔

کلثوم سچ مچ ننگی ہو رہی تھی۔ جسم کا رنگ لباس کے رنگ پر غالب آگیا تھا۔

سب ایک ساتھ ہنس دیے۔ اماں بولیں "کوئی اور ہوتا تو بارش کے ڈر سے دن بھر اسکول میں دبکا پڑا رہتا۔ پر کلثوم تو میری مرد بیٹی ہے، جلدی سے کپڑے بدل ڈال بیٹا۔ زکام ہو جائے گا"

سب باہر چلے گئے تو کلثوم نے کپڑے اتارے اور رات کا لباس پہننے کے لئے کھونٹی کی طرف بڑھی، بکس پر رکھے ہوئے ذرا سے آئینے میں اس کے جسم کا ایک حصہ جھلکا تو وہ یوں چونکی جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہے، پھر جلدی سے شلوار پہنی اور جمپر پہننے سے پہلے آئینے کو الٹا رکھ دیا۔ جمپر پہن کر آئینہ اُٹھایا اور ٹہلتے ہوئے اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے زور کی ایک چھینک آئی اور اماں نے باہر سے پکارا "ہو گیا نا زکام"

"جی ہاں۔ ہو گیا" اس نے جواب دیا اور آئینے کو بکس پر رکھ کر بستر پر گر پڑی۔

اور جب زہرہ اسکول سے واپس آئی تو کلثوم بخار سے تپ رہی تھی۔

تین روز یہی کیفیت رہی، اور جب چوتھے روز اس کا بخار اترا تو اماں نے بڑے پیار سے پوچھا "چھٹی کے دنوں کی تنخواہ ملتی رہتی ہے بیٹا؟"

"نہیں امی" اس نے کہا "سنا ہے کٹ جاتی ہے، کچی نوکری ہے نا۔ یا شاید مل ہی جائے۔"

"تو پھر بیٹا" اماں بولیں "آج کسی نہ کسی طرح اسکول چلی جاؤ، کوئی اور ہوتا تو بخار اترنے کے بعد دنوں تک بستر پر سے نہ اٹھتا پر تم تو میری مرد بیٹی ہو۔"

رضیہ ایک طرف بیٹھی نذر کے کرتے کی مرمت کر رہی تھی۔ چونک کر بولی "خدا کی قسم امی تم بھی عجیب امی ہو۔ ایسی تو کمزور ہے کلثو۔ جلد میں سے ہڈی باہر آرہی ہے، کیسے جاسکے گی؟"

"نہیں جائے گی تو تمہیں کہاں سے ٹھنسوائے گی" اماں جانے کیوں اچانک بلبلا اٹھیں

اور رضیہ خلافِ معمول یوں خاموش ہو گئی۔ جیسے وہ لاجواب کر دی گئی ہے، اس نے بس ایک بار بڑی بے بسی سے کلثوم کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں یوں جھک گئیں اس کے پپوٹوں میں سیسہ بھر گیا ہے۔

کلثوم کچھ نہ بولی۔ وہ اٹھی۔ باہر نل پر ہاتھ دھوئے، کپڑے بدلے اور اسکول جانے لگی تو زہرہ کہیں سے بھاگی آئی اور اس سے پٹ گئی۔ "نہیں اپی۔ آپ نہیں جاسکتیں۔ بس۔"

"تو کیا فاقوں مرنا ہے؟" کلثوم نے زہرہ کو جھڑک دیا اور زہرہ یوں ایک

طرف بت بن کر کھڑی ہو گئی جیسے شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا ہے۔
فرخ اس روز کپڑے دھو رہی تھی۔ کلثوم کو جاتے دیکھا تو صابن کا ہسہاتا جھاگ ہاتھوں میں لیئے پاگلوں کی طرح اٹھی اور بولی "کہاں چلی ہو کلثو؟ دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟ رات بخار میں پھنکتی رہی اب چلی ہے وہاں لڑکیوں سے دماغ چٹوانے" —— پھر وہ رکی اور الفاظ اس کے ہونٹوں میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اماں کی طرف دیکھ کر صرف اتنا کہہ سکی "پر خیر۔ اللہ بڑا رحیم ہے؛ جاؤ۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر کم بخت جینے کی عادت نہیں ورنہ —— خیر کلثو جاؤ۔ جانا تو ہے ہی"
"جانا تو ہے ہی" زہرہ نے جل کر زیر لب فرخ باجی کی نقل اتاری۔
کلثوم فوراً صحن طے کر گئی۔ کیونکہ اس نے اماں اور باجی کے تیور دیکھ لئے تھے اور اماں تو زہرہ کو آپے میں رہنے کا حکم دے کر اس کی طرف بڑھ بھی چکی تھیں۔
اس گھر میں کلثوم کے باعث جو ذرا سا تلاطم پیدا ہوا تھا۔ وہ تو اسی وقت مٹ گیا تھا جب رضیہ آپا نے کلثوم کو اپنی مسکراہٹ دے کر اس کے آنسو لے لیئے تھے۔ مگر تلاطم ہزار ہنگامی سہی۔ ساحل کی ریت کے زاویے ضرور بدل دیتا ہے۔ اور کلثوم کی سوچوں کے زاویے یکسر بدل گئے تھے۔ وہ بہنوں اور اماں کے سامنے خوب خوب ہنستی اور ہنستے ہنستے اچانک یوں خاموش ہو جاتی جیسے اسے اچانک احساس گناہ ہو گیا ہے۔ پھر وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور چٹخنی چڑھا کر اور دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر خوب خوب روتی۔ دروازے

پر رضیہ زور زور سے دستک دیتی، فرخ جھریوں میں سے جھانکتی۔ اور اماں مشورہ دیتیں "رونے دو پگلیو۔ رونے دو ذرا سا جی ہلکا ہو جائے گا بے چاری کا۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ دن بھی آئے گا جب یہ رو بھی نہیں سکے گی۔ مجھے کبھی یوں چھاجوں روتے دیکھا ہے تم لوگوں نے؟ کلیجہ پک جاتے تو آنسو جل جاتے ہیں، رونے دو۔" رضیہ دروازے پر دوہتڑ مارتی اور چیختی "دروازہ کھولو کلثو ورنہ میں انگارہ چبا لوں گی۔" اور کلثوم فوراً دروازہ کھول دیتی۔ رضیہ کی اس دھمکی میں اسے سچائی دکھائی دیتی اور وہ سوچتی کہ انگارہ چبانے کی دھمکی دے کر صرف وہی لوگ سچ مچ انگارہ چبا سکتے ہیں۔ جن پر مرگی کے دورے پڑتے ہوں۔ سوجھ بوجھ والے لوگ تو مرنے کی دھمکی دے کر شاہی مسجد کے مینار سے کودنے جائیں گے۔ تو مینار پر سے شہر کی سیر کر کے، سیٹی بجاتے نیچے اتر آئیں گے۔ خلوص تو دیوانوں کی دولت ہے، فرزانوں کا سارا کلچر تو جھوٹ اور ریا کی بنیادوں پر اٹھا ہے، اور جمال کیسے مر سکتا ہے جب کہ اتنا وسیع مستقبل اس کے سامنے پھیلا ہوا ہے اور وہ جوان ہے ——— لیکن جوان تو وہ خود بھی تھی۔ تنہائی میں وہ آئینہ اٹھا کر چہرے کو مختلف زاویوں سے دیکھتی اور پھر اس کے منہ کا ذائقہ بدل جاتا۔ اس کے چہرے کی تجلی غائب ہو جاتی، اور انبالے کے کالج کی سائنس لیبارٹری میں رکھے ہوئے انسانی ڈھانچے کی طرح وہ بالکل ننگی ہو جاتی۔ اور پھر چمکتی ہوئی کھوپڑی میں آنکھوں کے سوراخوں کی پرلی طرف دو چتائیں سی جلنے لگتیں، اور وہ اپنے آپ سے ڈر جاتی۔

وہ سارا ہفتہ اتوار کے دن سے ڈرتی رہتی اور جب اتوار آتا تو وہ جیسے

اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر بہنوں اور اماں کے درمیان جا بیٹھتی، لطیفے سناتی کہانیاں کہتی، پہیلیاں بجھواتی اور تالیاں بجا بجا کر ہنستی، پھر ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو کر کسی نقطے پر یوں نظریں گاڑ دیتی جیسے آئینہ دیکھ رہی ہے۔

"اونٹ"۔ رضیہ پہیلی بوجھتی۔

اور کلثوم چونک کر بڑی متانت سے کہتی "نہیں آپا۔ اونٹ نہیں سوئی!"

سب بے اختیار ہنستے اور وہ ایک بار پھر سب کا ساتھ دیتی لیکن اسے محسوس ہوتا کہ اس کے پھیپھڑے قہقہوں کی صورت میں اپنا بوجھ اتار رہے ہیں۔ مگر یہ بوجھ منہ سے نکلنے کی بجائے تڑ سے اس کے دماغ پر گر پڑتا ہے، اور اس کے تنے ہوئے اعصاب ساز کے تاروں کی طرح جھنجھناتے رہ جاتے ہیں۔ اور اس کی پتلیوں کے پیچھے آنسو بھتنوں کی طرح ناچتے ہیں۔

تنگ آ کر وہ وہاں سے اٹھ آتی اور اس کے بعد اتوار کے دن کا وہ حصہ شروع ہوتا جو اس کے ذہن کا کابوس تھا۔ ایک ایسا سناٹا جو گھر اور محلے کے شور و شغب سے بالکل غیر متاثر رہتا تھا۔ اس خوفناک سناٹے میں اس کے کانوں کے آس پاس جھینگر بولتے اور دماغ میں جیسے ایک بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس کر بھنبھناتی رہتی۔ اور اسے بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہوتا جیسے سر کے بل کھڑی ہے۔ اور جب وہ اس خیال کو جھٹکنے کے لئے بھڑک کر اٹھ بیٹھتی تو وہ جیسے گلے گلے پانی میں ڈوب جاتی۔ گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوتی، پھر کھاٹ پر گر پڑتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔ سناٹا اس کے آس پاس جمع ہو کر رونے اور کراہنے

لگتا اور وہ بھاگ کر زہرہ کے کمرے میں چلی جاتی ۔ اس کے ہاتھوں سے کتاب چھین کر کہتی "دنیا کے مشہور جزیرے"! ــــ اچھا تو جغرافیہ پڑھ رہی ہے میری زہرو ۔ بھلا بتاؤ تو جزیرہ کیا ہوتا ہے ؟ خیر یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا ۔ یہ تو بتاؤ کہ جزیرہ کیوں ہوتا ہے ؟ اور عموماً جزیروں کی زمین میں خیالوں کی کھیتی اتنی شاداب کیوں ہوتی ہے ۔ وہاں ناریلوں کے جھرمٹوں میں ندیاں کیوں گنگناتی ہیں اور چڑیاں اور چپے چشموں کے کنارے بیٹھ کر دن بھر نہاتے اور چہکتے کیوں رہتے ہیں ۔ بتاؤ تمہاری کتاب میں ان سوالوں کے جواب ہیں ؟ نہیں ہیں نا ؟ نہیں ہوں گے ، ایسی باتیں جغرافیے کی کتابوں میں کہاں ۔ جغرافیہ تو ہمیں صرف یہ بتاتا ہے نا کہ بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیسے ہوتی ہے ۔ اور یہ ہمیں صرف ناول اور غزلیں ہی بتا سکتی ہیں کہ جب بادل اُمڈتے ہیں تو دلوں میں بھونچال کون انڈیل دیتا ہے ، اور جب بارش ہوتی ہے تو چھت پر بوندوں کی آواز سے کتنے بیتے زمانوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ۔ پر تم نے ناول کہاں پڑھے ہیں ، میں نے ایک ناول میں پڑھا تھا زہرو کہ بحرالکاہل کے دور دراز جزیروں میں جو نوجوان اپنی محبوبہ کو ایک بار زبردستی اغوا نہیں کر لیتا وہ اس سے شادی کرنے کا حقدار نہیں ہوتا اور جب وہ اسے اغوا کر لیتا ہے تو محبوبہ کی بہنیں اور سہیلیاں آتی ہیں ، اور اپنی بہن کے بالوں میں پھول سجاتی ہیں اور اپنے بہنوئی کے ماتھے پر مشعل کا شعلہ بناتی ہیں اور اسے چومتی ہیں ــــ یوں "۔ وہ دم بخود زہرہ کو چوم لیتی ، اور پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور وہ زہرہ کے گال پر یوں ہاتھ پھیرتی جیسے اپنے پیار کے اثرات کو جھاڑ رہی ہے ۔

فرخ اسے الگ لے جاکر آہستہ سے کہتی "چھوٹی بہنوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے پیاری، چال چلن بگڑ جاتے ہیں۔ سب لوگ تمہاری طرح فرشتہ تو نہیں کہ تیئیس برس کی ہونے کو آئی ہو مگر مجال ہے جو ————" الفاظ اس کے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر رہ جاتے، پھر وہ بڑی راز داری سے پوچھتی "اب جمال تو یاد نہیں آتا؟"

کلثوم اپنی باجی کی طرف صرف دیکھتی ہی رہ جاتی۔ اور اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں دھوپ کی چمک الاؤ سے لگا دیتی اور اس کے نتھنے نہ جانے کہاں سے خون سمیٹ کر گلابی ہو جاتے اور پھڑکتے۔

پھر وہ چونک کر آنسو پونچھ ڈالتی اور رضیہ کو کہیں سے ڈھونڈ نکالتی۔ جو ہمیشہ کہیں کسی کونے میں دبکی کچھ نہ کچھ سی رہی ہوتی یا نذر اور نذیر میں سے کوئی ہتھے چڑھ جاتا تو جوئیں تلاش کر رہی ہوتی۔ رضیہ سے وہ صرف اس وقت لمبی لمبی شاعرانہ باتیں کرتی تھی جب اس پر ایک کرب آمیز سرور کی سی کیفیت طاری ہوتی۔ وہ آپا سے ستاروں اور بادلوں سے لے کر ساحلِ سمندر کی سیپیوں اور ندی کنارے کے کنکروں تک کی باتیں کرتی اور رضیہ کبھی کسی موضوع سے اکتاتی نہیں تھی۔

"ہاں ہاں یہ بادل" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی "جیسے فرشتوں کے کپڑے پھٹ گئے ہوں" وہ قہقہے مارتی اور نذر کے کالر کو رفو کرنے لگتی۔

کلثوم اسے چھیڑتی "آپا، میں سوچتی ہوں یہ آسمان پر جو ابابیلیں اڑ رہی

ہیں تو یہ کیوں اڑ رہی ہیں ؟"

رضیہ بادلوں کے پس منظر پر ابابیلوں کی اڑانوں کے دائرے اور قوسیں دیکھ کر مسکراتی "ابابیلیں اس لئے اڑ رہی ہیں میری جان کہ یہ ابابیلیں ہیں، کلثو نہیں ہیں"

کلثوم اداس ہو کر اپنے کمرے میں آجاتی. حساب کا کوئی نہایت مشکل سوال حل کرنے بیٹھ جاتی اور پھر اچانک یہ ہندسے لمبی لمبی ٹانگوں والے کیڑے بن کر کاغذ پر سے اٹھتے اور ایک قطار بنا کر اس کے دماغ میں گھسنے لگتے۔

"میں پاگل ہو گئی ہوں!" وہ چلا اٹھتی۔

"تمہارے دشمن پاگل ہو رہے ہیں" فرخ ساتھ والے کمرے سے بولتی۔

"کس کے دشمن پاگل ہو رہے ہیں ؟" رضیہ سوئی کا لمبا ڈورا اڑاتی ہوئی بھاگتی۔

اور اماں ویران خلاؤں بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتیں دیکھتی رہ جاتیں اور پھر ایکا ایکی کد دیکھیلنے لگتیں۔

اتوار ہی کا دن تھا جب کلثوم اکتا کر اوپر چھت پر چلی گئی۔ اور ٹہلنے لگی۔ وہ دیر تک یونہی بیکار ٹہلتی رہی۔ اور پھر چھت کی چار دیواری پہ کہنیاں رکھ کر نیچے گلی میں دیکھنے لگی۔ مقابل کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک نوجوان کلثوم کی طرح کہنیاں ٹیکے کھڑکی کے نیچے بہتی ہوئی نالی کو دیکھ رہا تھا۔ کلثوم کو اوپر سے صرف اس کے بال نظر آئے۔ جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ وہ دیر تک دھوپ میں چمکتی ہوئی ان لہروں کو یوں دیکھتی رہی جیسے سمندر کے کنارے کھڑی ہے، پھر

ایک دم اسے خیال آیا کہ نوجوان آخر اتنی دیر تک کہنیاں ٹیکے اور چہرے کو ہتھیلیوں پر رکھے کیسے دیکھ رہا ہے، نیچے گندی نالی ہے جس میں وُہ اپنے سگرٹ کی راکھ جھاڑ دیتا ہے اور بس ــ تو یہ کیا نظارہ ہوا! ٹھیک ہے، اس نے سوچا۔ میں بھی تو اتنی ہی دیر سے کھڑکی اس کے بالوں کو دیکھ رہی ہوں پر میں تو ناکام محبت ہوں نا! اس نے ناولوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح نوجوان کا چہرہ دیکھ لے۔ مگر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کا کوئی طریقہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ اچانک اس نے سلیپر اتارا اور اسے دیوار پر زور سے مار کر بولی "بچھو!" اس نے فوراً نیچے دیکھا۔ نوجوان اب اوپر دیکھ رہا تھا۔ کلثوم فوراً دیوار کے پیچھے چھپ گئی اور طلوع سحر کتنے دنوں کی دھول میں سے نکل کر اس کے ہونٹوں میں رچ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اٹھ کر نیچے دیکھا۔ "بچھو!" نوجوان نے دھک سے کھڑکی کی لکڑی پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور اوپر دیکھا، اب کے وہ پھر چھپ کر بیٹھ گئی اور پھر وہاں سے بھاگ کر نیچے اتر گئی۔ اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے کی طرف رخ کر کے آئینہ دیکھا اور پکاری "باجی! وہ چھائیوں مہاسوں والی کریم ختم ہو گئی کہ کچھ بچی رکھی ہے؟"

"رکھی ہے پیاری" فرخ دوسرے کمرے سے بولی "لے جاؤ"

"ذرا نذر میاں کے ہاتھ بھجوا دیجیئے گا باجی" اس نے آئینے میں اپنے ہونٹوں کی جنبش کا بغور معائنہ کیا۔ پھر وہ مسکرا کر زیر لب بولی "ذرا نذر کے ہاتھ بھجوا دیجیے گا باجی"۔ اور پھر وہ "باجی باجی" دہرانے لگی اور پھر مسکرانے لگی اور اس نے محسوس

کیا کہ اس کے ہونٹوں کی جنبشوں میں کمانوں کی سی توسیں اور مسجد کی محرابوں کا سا بھرپورپن اور حسن ہے، اور بندر کے گریم لانے سے پہلے ہی اس کے چہرے کی چھائیاں مٹ گئی ہیں اور وہاں گھروندے کے جلنے کی بجائے شفق پھول رہی ہے!

اسکول کی لڑکیوں تک نے محسوس کیا کہ استانی جی کی بکایک کایا کلپ ہوگئی ہے، تفریح کے وقفے میں وہ استانیوں سے خوب چہکتی رہی اور ہیڈ مسٹرس کے اس حکم کو بغیر کسی احتجاج کے مان لیا کہ فارسی کی استانی کی رخصت کے ایام میں وہ فارسی بھی پڑھاتی رہے گی۔ جب وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو حاضری کے رجسٹر کے نیچے ایک چٹ پڑی تھی جس پر لکھا تھا "یہ مدن فصل خزاں میں ہجوم گل کیسا!" صاف جمال کی تحریر تھی۔ پہلے تو وہ بجھ سی گئی مگر پھر یوں مسکرائی جیسے شاعر سچ مچ کے اچھے شعر پر داد پاکر آسودگی سے مسکراتا ہے۔

چھٹی کے بعد واپس گھر کو جاتے ہوئے ساڑھی کا پلو سر سے گر کر کندھے پر پھڑپھڑانے لگا اور پھڑپھڑاتا رہ گیا۔ اور اس کے اتنے بہت سے ڈھیر سے بال اس کی پیٹھ پر اڑتے اور مچلتے رہے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ چاہتی تھی کہ پڑوس کی کھڑکی کی طرف دیکھتی چلے مگر گردن میں جیسے لوہے کی سلاخ گڑ گئی تھی۔ ناک کی سیدھ میں لپکی چلی گئی۔ گھر کے دروازے پر ذرا سا ٹھٹکی اور ایک پل میں کتنے بہت سے ارادے کیے۔ مگر سب ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھتے چلے گئے۔ اور آخر گھر میں داخل ہوگئی۔ صحن خالی تھا۔ نصف صحن طے کرنے کے بعد وہ پلٹی اور سیڑھیوں کا رخ کیا۔ دبے پاؤں چھت

پر گئی اور بڑے اطمینان سے سیدھی چار دیواری تک چلی گئی۔ اس نے نیچے دیکھا۔

کل کی طرح آج بھی نوجوان کا سر کھڑکی میں رکھا تھا اور دھوپ نے اس کے بالوں کی لہروں میں شعاعیں گوندھ دی تھیں۔ کلثوم بڑی آزادی سے کھنکاری نوجوان نے اوپر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پلٹ کر کمرے کے اندر جھانکا اور پھر ایک دم پانچ اور سر اس کے سر کے آس پاس سج گئے۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کلثوم کو دیکھنے لگے اور کلثوم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نوجوان کو دیکھنے لگی، دراصل یہ سارا تماشہ اس کی سمجھ میں نہ آیا اور وہ ابھی اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ نوجوان نے اسے کچھ یوں آنکھ ماری کہ کلثوم کو تیر کے کمان سے چھوٹنے کی سی آواز سنائی دے گئی۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کپڑے اتار لئے ہیں۔ ابھی وہ اپنی عریانی کو سمیٹنے ہی کی فکر میں تھی کہ نوجوان کے پانچوں دوست چلا چلا کر قہقہے مارنے لگے اور وہ جیسے سنگ باری سے بچنے کے لئے دھب سے چھت پر گر پڑی۔

نیچے سے آواز آئی "آپ بہت دیر سے آئیں خالہ جان، صابر کی تو کل پرسوں شادی ہو رہی ہے۔"

دوسری آواز آئی "اجازت ہو تو صابر آپ کو منہ بولی اماں کہہ لے ماسی۔"

لمبے لمبے قہقہے چیخیں بن گئے اور کلثوم کے قدموں تلے جیسے چھت ڈوبنے لگی اور ڈوبتی چلی گئی۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے منہ میں ہاتھ ڈال کر اپنا جبڑا پھاڑ ڈالے۔ اپنے بالوں کو مٹھیوں مٹھیوں لےکر بکھیر دے، اور اپنے جسم کو دیوار پر پٹخ پٹخ کر ادھیڑ ڈالے، پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس کی پتلی دبلی ناک لٹک کر اس کے ہونٹوں کو چھو رہی ہے۔ ہونٹ لٹک کر ٹھوڑی پر جھول رہے ہیں اور ٹھوڑی لٹک کر اس کے سینے میں گر گئی ہے، وہ بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف گئی۔ ابھی وہ سیڑھیوں پر سے اتر ہی رہی تھی کہ اماں کی آواز آئی "یہ اوپر چھت پر کون ہے؟"۔ اور وہ آخری سیڑھی پر تھی جب اماں، فرخ، رضیہ اور زہرہ کمروں میں سے باہر آگئیں اور کلثوم کو دیکھتے ہی اماں اور فرخ کے چہروں پر راکھ اڑنے لگی،

"کب آئیں؟" اماں نے پوچھا۔

"اوپر کیا کرنے گئی تھیں؟" فرخ بولی۔

"آئیں کب؟" اماں نے پھر پوچھا،

"ابھی آئی ہوں" وہ بولی،

"اوپر کیا کرنے گئی تھیں" فرخ نے تو جیسے چور پکڑ لیا تھا۔

"اوپر کل پنسل گر گئی تھی" انتہا درجے کی گھبراہٹ میں بھی اسے بہانہ سوجھ گیا۔ "اسکول میں یاد آئی، اب واپس آئی ہوں تو میں نے کہا کہ دیکھتی چلوں"۔

"مل گئی؟" اماں نے پوچھا،

"جی ہاں" کلثوم نے پنسل دکھا دی،

"چلو اچھا ہوا" اماں واپس جانے کے لئے پلٹیں۔

"بھاگی کیوں تھیں؟" فرخ نے وکیلوں کی سی جرح شروع کر دی۔

"بھاگا کون تھا؟" کلثوم کے لہجے میں تبدیلی آگئی۔ "ساڑھی پاؤں میں الجھ گئی تو ذرا سا لڑکھڑا گئی تھی"

"چوٹ تو نہیں آئی میری جان؟" رضیہ ماں کا فرض ادا کرنے آگے بڑھی

"جی نہیں" کلثوم نے جھوٹ بولا،

"آیئے آپی آپ کا پاؤں دبا دوں" زہرہ نے پیار سے کہا،

"دب جائے گا بلو" کلثوم کا لہجہ پھر نارمل ہو گیا۔

"اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہو رہا ہے؟" فرخ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اور کلثوم بھڑک اٹھی۔ اس کے تیور بدل گئے، رنگ زرد ہو گیا اور پھر اس زردی میں نیلاہٹ بھر گئی، چلا کر بولی۔ "میرے چہرے پر لعنتیں ہیں۔ میرے چہرے پر ٹیکے ہیں کلنک کے، سنا آپ نے؟ میرے چہرے پر ساری دنیا کی نجاست لپی ہوئی ہے، اب کچھ تسلی ہوئی آپ سب کی؟ کہئے تو کچھ اور بھی بتا دوں۔ میرے چہرے پر مردوں کے بوسے نقشے ہوئے ہیں اور میری آنکھوں میں بےحیائی ہے اور میری ——————" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور وہ ایک دم سکتے کے سے عالم میں آگئی۔

اماں آگے بڑھیں اور کلثوم کے تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا ہی رہی تھیں کہ رضیہ جھپاک سے دونوں کے درمیان آگئی فرخ نے دیوار سے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ اور زہرہ دونوں ہاتھوں کو دونوں گالوں پر رکھے

موم کی مریم کی طرح ڈبڈبائی اور سہمی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

رضیہ چلائی "دیکھیے امی۔ اگر آپ کلثو کو ماریں تو میری لاش پر چلیں"

اماں کے سارے جسم میں رعشہ تھا اور جب وہ بولیں تو ان کی آواز میں بھی رعشہ تھا "میں تو تم سب کی لاشوں پر چل چکی نگوڑ یو۔ میں تو اپنی لاش کو بھی روند چکی۔ میں تو کہیں کی نہ رہی تم حرامزادیوں کو جن کر۔ اور یہ لومڑی کی سی صورت والی استانی کیا بنی معلوم ہوتا ہے اسکول نہیں جاتی، چکلے جاتی ہے، مردوں کے بوسوں کی باتیں ہو رہی ہیں اپنی کنواری اور بیوہ بہنوں کے سامنے، آنکھوں کا پانی مر گیا۔ دیدے بھیک کے پیالے بن گئے، جوتوں سمیت گھس رہی ہے سب کی آنکھوں میں۔ اور یہ مرگی کی ماری پگلوٹ ڈھال بنتی ہے! ـــــ ہٹ جا میرے سامنے سے" میں دیکھوں تو اس کی زبان کے گز لمبی ہے، ہٹ جا"

"نہیں ہٹتی" رضیہ نے چلا کر جواب دیا،

فرخ نے اٹھ کر اماں کو تھام لیا مگر اب زور آزمائی شروع ہو گئی، ساتھ ساتھ اماں "حرامزادیو، الو کی پٹھیو، ڈائینو، چڑیلو بھتنیو، چھلپائیو" کی گردان کرتی چلی گئیں،

فرخ کو بے بس پا کر سرخ چہرے پر آنسو ہی آنسو لئے زہرہ آئی اور بولی۔

"بس اب جانے بھی دیجئے اماں"

اب اماں نے زہرہ کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو کلثوم رضیہ کی پناہ میں سے نکل کر آئی اور بولی "ٹھہریئے امی۔ زہرہ کو نہ ماریئے۔ اگر آپ کا ہاتھ ایسا ہی بے تاب ہے تو آیئے، میرے منہ پر تھپڑ ماریئے"

رضیہ چلائی "اگر آپ نے میری کلثو کو تھپڑ مارا تو میں انگارہ چبا لوں گی"

"چبا لے میری بلا سے!" اماں نے چیخ کر کہا اور انہوں نے کلثوم کے ننگے شانے کا تھپڑ مار دیا۔ یہ تھپڑ اس زور سے لگا جیسے پٹاخہ چھوٹا ہے،

رضیہ چولہے کی طرف بھاگی۔

"بس؟" کلثوم نے اماں سے پوچھا "یا ابھی کچھ اور باقی ہے؟"

"باقی یہ ہے" اماں بدستور چلا رہی تھیں "کہ یہ کپڑے وپڑے پھاڑ کر ننگی ہو جا۔ اور کیا باقی ہے؟"

"لیجیے" کلثوم بولی۔

اس نے ساڑھی کو نوچ کر پھینک دیا اور بلاوز کو گلے میں ہاتھ ڈال کر یوں جھٹکا دیا کہ وہ بیچ میں سے پھٹ کر اس کے پیٹی کوٹ پر لٹکنے لگا۔ اور وہ اسی ننگی حالت میں ماں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی "اور کیا باقی ہے؟"

چولہے کی طرف سے رضیہ کی ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی مگر کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اماں۔ فرخ اور زہرہ چہروں پہ ہاتھ رکھ کر بلک بلک کر رونے لگیں اور کلثوم جس کا رنگ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ ان کی طرف کچھ دیر پلکیں جھپکے بغیر دیکھتی رہی۔ اور پھر کچھ اس زور سے منہ کے بل گری کہ اماں اور بہنوں کے چہرے مارے خوف کے لاشوں کی طرح بگڑ گئے، ادھر ننگی کلثوم خاک پر سینے کے بل بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اور اماں فرخ اور زہرہ کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی جیسے انہیں کسی نے اکٹھے بہت سے تیز چکر دے کر بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ پھر تینوں کلثوم کی طرف بڑھیں۔ اسے اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گئیں۔ اماں نے سب سے پہلے تولیے سے اس کا سینہ ڈھانپا۔ اس کے بعد چہرے پر پانی چھڑکا، منہ میں

پٹکانے کی کوشش کی مگر تپسی جڑ چکی تھی، چمچے کی مدد سے بھنچی ہوئی بتیسی کھولنے لگیں تو باہر سے نذرا اور نذیر چلائے "امّوں۔ اے امّوں۔ ماسی پر جن آ گئے"

اس وقت سب کو پہلی بار رضیہ کا خیال آیا۔ فرخ باہر دوڑی۔ زہرہ دروازے تک جا کر پلٹ آئی، اماں نے صرف اتنا کہا "رضیہ کی لاش کو ادھر بڑے کمرے میں گھسیٹ لے جاؤ"

کلثوم ہوش میں آ گئی، آنکھیں کھول کر وہ ایک لمحے تک جیسے ماں کو پہچانتی رہی اور پھر ہڑبڑا کر جسم کے ننگے حصے کو چھپانے کی کوشش میں ایک بار پھر ننگی ہو گئی، بے بسی کے عالم میں رو دی اور پکاری "آپ ذرا باہر جایئے"۔ زہرہ اماں سے پہلے باہر نکل گئی تھی۔ اور جب اماں بھی چلی گئیں تو کلثوم کود کر فرش پر آ رہی، ڈگمگا کر کھاٹ پر گر پڑی۔ سر کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ جمپر کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ مڑی اور سامنے بکس پر رکھے ہوئے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آ گیا۔ اور اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ آئینے میں اس کے ماضی کے سارے حادثے نہایت تیزی سے ایک ایک کر کے گزرنے لگے اور جب یہ طوفان تھما تو آئینے میں وہ بھی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں، وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس المیے کا انجام بھی دیکھے ——— انجام! ——— اس نے انگلیوں کی جھریوں میں سے آئینے کو دیکھا۔ اور پھر جیسے ایک عزم کے ساتھ ہاتھ نیچے گرا دئے، بڑھ کر اس نے آئینہ اٹھا لیا اور دروازے کے پاس جا کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی تھی کہ نذرا اور نذیر دوسرے کمرے میں سے روتے ہوئے نکلے اور کلثوم کو دیکھ کر نذیر بولا "رضیہ ماسی مر گئیں"

"مرگئیں!" کلثوم چیخ اٹھی اور آئینہ اس کے ہاتھ میں لٹک گیا۔ وہ باہر لپکی۔

"کون مرگیا!" اماں نے دوسرے کمرے میں سے تیزی سے نکل کر پوچھا۔

"رضیہ آپا" کلثوم نے جواب بھی دیا اور سوال بھی کیا۔

"اس کے دشمن مریں" فرخ نے دروازے میں سے کہا۔

ان کے عقب سے زہرہ بولی "وہ تو ابھی ابھی ہوش میں آئی ہیں تو اٹھ کر آپ کے پاس جانے کی کوشش کی پر اٹھ نہ سکیں۔ چارپائی پر گرتے ہوئے بولیں "ہائے میں مرگئی!" اور نذرا اور نذیر نے —— " زہرہ ہنسنے لگی۔

ماحول ہنسنے کا نہیں تھا مگر سب ہنسنے لگے۔ ارادے کے خلاف ہنسنے لگے، اور یوں ایک حقیقت سے کچھ دیر کے لئے دور بھاگ گئے، بچھو کاٹ لے تو بھی ایک بار انسان یہ ضرور سوچ لیتا ہے کہ شاید کانٹا ہی چبھا ہو۔ اس وقت کلثوم بھی ہنسی تھی اور اس نے آئینے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے نذرا اور نذیر کی طرف دیکھا تھا جو دیوار سے لگ کر کھڑے زہرہ کے انکشاف پر شرمندہ ہو کر ہونق سے لگ رہے تھے "ادھر آؤ" کلثوم بولی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور کلثوم نے جھک کر دونوں کو چوم لیا۔ یہ پیار جیسے سب کے ماتھوں میں نفوذ کر گئے، پھر اندر سے رضیہ کی آواز آئی "کلثو میری جان۔ دیکھا، آخر میں نے انگارہ چبا ہی لیا نا!"

کلثوم کے ہاتھ سے آئینہ گر پڑا اور وہ اندر لپکی۔ نذر نے آئینہ اٹھا کر اندر بکس پر رکھ دیا۔

رضیہ نقاہت سے کراہ رہی تھی۔ اس کے بالوں اور کپڑوں میں مٹی بھری تھی

اور اس کے ہونٹوں پر آبلے تھے! وہ کلثوم کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اسے چومنا چاہا تو اچانک ہونٹ پکڑ کر بیٹھ گئی اور کراہنے لگی، پھر لال لال آنکھیں پھاڑ کر بولی: "مسکرا میری جان۔ تو نہیں مسکرائے گی تو میں ایک اور انگارہ چبا لوں گی۔" اور کلثوم کے چہرے پر گھروندا جلنے لگا۔ "یوں ہی مسکراتی رہ کہ میری کلثو پگلو۔ تیری نہری یہی شرط ہے، یہ سب تو ظالم ہیں۔"

"ہونٹوں پر کریم لگا لیجئے آپا" کلثوم نے کہا "آبلوں کی جلن کم ہو جائے گی۔"

"آبلے خود بخود خشک ہو جاتے ہیں میری جان" رضیہ بولی "اور پھر یہ تو ہونٹوں کے آبلے ہیں، دلوں کے آبلے بھی ——" رضیہ نے ڈر کر اماں کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

اماں ہنسنے لگیں۔ پھر سب ہنسنے لگے اور کلثوم نے اس ہنگامے میں کہا۔ "قسم خدا کی رضیہ آپا۔ آپ تو فرشتہ ہیں، آپ کے دم سے اس گھر کا سونا پن گنگنانے لگتا ہے۔"

پھر سب اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سب کے حلق میں ایک بات ہڈی کی طرح یوں اٹک گئی ہے کہ نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔

اس تکلیف دہ سناٹے کو رضیہ آپا نے توڑا۔ بولیں "یہ ہم سب کو ایک دم ہو کیا جاتا ہے؟"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سب کی نظریں اماں پر جم گئیں۔ جو ان پوچھتی ہوئی نظروں کے بوجھ کی تاب نہ لا سکیں اور اچانک بلبلا کر رو دیں۔ انہوں نے اپنے ہی دوہتڑوں سے اپنا منہ پیٹ لیا اور پھر اپنے

دائیں ہاتھ کو دانتوں میں دبا کر اس زور سے کاٹا کہ سب نے اپنے اپنے ہاتھ اٹھا کر منہ پر رکھ لئے۔

کلثوم اس دھوپ چھاؤں کی تکرار سے اکتا کر اپنے کمرے میں آ گئی، کچھ دیر کے بعد وہاں زہرہ بھی آ نکلی۔ اسے سینے سے لگا کر کلثوم نے اسے بہت سے پیار کئے اور بولی "تو بڑے بدنصیب گھر میں پیدا ہوئی میری زہرہ۔ میں سوچتی ہوں جب تو پڑھ لکھ جائے گی تو کیا ہوگا۔ پڑھا لکھا تو میں نے بھی ہے پر ہُوا کیا؟ کچھ نہیں ہُوا۔ ایک لاکھ جمع ایک لاکھ مساوی صفر کے، حساب کا یہ ایک نیا طریقہ میں نے ایجاد کیا ہے، اور پھر جو بیٹی پڑھ لکھ جائے تو مرد بیٹی بن جاتی ہے اور اس کے مونچھیں نکل آتی ہیں۔"

"مونچھیں!" زہرہ چونک اٹھی تھی۔

اب کے کلثوم بھی چونک اٹھی "لاحول ولا قوۃ۔ جانے بیٹھے بیٹھے میں بکواس کیوں کرنے لگتی ہوں، چلو ذرا چھت پر ٹہل آئیں۔"

"چلیئے" زہرہ کمرے سے ویسے ہی بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔

دونوں اوپر آئیں، آخری سیڑھی پر سے چھت پر قدم رکھتے ہی کلثوم کے اعصاب تن گئے، وہ پاگلوں کی طرح ناک کی سیدھ میں آگے بڑھی اور دیوار پر سے نیچے گلی میں تھوک دیا۔ ایک لمحہ وہ وہاں تن کر کھڑی رہی۔ پھر لڑکھڑا کر دیوار کو جکڑ لیا۔ گلا صاف کر کے منہ پر لٹکتے ہوئے بالوں کو پیچھے جھٹک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی "کیسی تازہ اور ٹھنڈی ہوا ہے زہرہ! کیوں؟ ہے نا؟"

"جی ہاں"

"آؤ نیچے چلیں"

اس عجیب و غریب استدلال پر احتجاج کئے بغیر زہرہ اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر آئی۔

کلثوم نے چھت پر جا کر سچ مچ تازہ ہوا سے پھیپھڑے بھر لئے تھے، اس روز شام تک اس کی صورت اور اس کے مزاج کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ وہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ کبھی بیٹھی ماں کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ کبھی اپنے سر سے بال پنیں نکال کر فرخ کے بالوں میں لگا رہی ہے۔ کبھی رضیہ کو موسم اور دنیا اور اپنے گھر کے بارے میں شاعرانہ باتیں کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ "فرض کیجئے آپا کہ دنیا اچانک بدل جاتی ہے۔ سب انسان ایک دم نیک ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ پھر کیا ہو گا؟"

"یہ ہو گا" رضیہ کہتی۔ "کہ جب کسی سے کوئی نفرت ہی نہیں کرے گا تو محبت کاہے کو کرے گا۔ اور سب انسان نیک ہو جائیں گے تو ادھر دودھ ملائی والے کے ریڈیو میں سے ہیر وارث شاہ کی آواز کہاں آئے گی اور بادل اڈیں گے تو تم کیسے گنگنا سکو گی پگلو۔"

اور پھر کلثوم آج زہرہ پر تو نچھاور ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی اس کی کتابوں کی جلدوں پر اخبار چڑھا رہی ہے۔ کبھی اپنا نیا تکیہ اس کے پرانے تکیے سے بدل رہی ہے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں کاجل لگا کر اس کے ایک گال پر سلائی کی نوک سے تل بنا رہی ہے۔ اور کچھ دور ہٹ کر اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے مصور اپنی

تصویر کو دیکھتا ہے۔ اس شام کو اس نے نذر اور نذیر کے لئے ملائی بھی منگوائی اور بہت رات گئے تک جلاہوں کے لطیفے بھی ہوتے رہے۔ گھر کا ماحول ایک دم یوں بدل گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اسی لئے جب سب صبح کو اُٹھے تو ہشاش بشاش تھے۔ کلثوم نے اسکول جاتے ہوئے گھر کے ایک ایک فرد کو رخصتی پیار کیا۔ رضیہ سے آبلوں کی کوئی دوا لانے کا وعدہ کیا اور یوں ٹھمکتی ہوئی چلی جیسے آج اس کی سولھویں سالگرہ ہے۔

اسکول جاتے ہی اسے جیسے کوئی بہت ضروری کام یاد آگیا۔ سیدھی جمال کے کمرے میں گئی مگر وہاں اسے معلوم ہوا کہ جمال کی صحت مسلسل گر رہی تھی اس لئے وہ دو مہینے کی چھٹی لے کر کسی پہاڑ پر چلا گیا ہے۔ اس کی کرسی پر ایک نیا کلرک بیٹھا تھا۔ "میرا نام طالب علی ہے" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے کلثوم کہتے ہیں۔ میں یہاں حساب پڑھاتی ہوں اور آج کل فارسی بھی پڑھا رہی ہوں۔"

"حساب اور فارسی!" طالب علی نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو مشرق و مغرب کا ملاپ ہے!"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوتی" کلثوم نے اس کی مجلسی غلطی درست کی،

"مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" طالب علی نے گھبرا کر جواب دیا۔

اسکول بند ہونے سے پہلے وہ پھر طالب علی کے پاس گئی اور بولی۔ "وہ میں اس لئے آئی ہوں کہ آپ سے ذرا اپنے گریڈ کے بارے میں پوچھ لوں، یہ

معلوم کرنا ہے کہ مجھے انکریمنٹ ملنا کب شروع ہوگی۔"

طالب علی بولا "کل تک عرض کر سکوں گا۔ ابھی سب رجسٹر نہیں دیکھ سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" کلثوم نے کہا "کل سہی۔ ویسے فی الحال یہ بتا دیجئے کہ — معاف کیجئے گا۔ بالکل ذاتی سوال ہے — یہ بتایئے کہ آپ شادی شدہ تو نہیں۔"

طالب علی کا دماغ پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے صاف نیلے آسمان کے کلیجے میں سے ایک بادل کو دکر نکلا ہے اور دہاڑنے لگا ہے۔

"تشریف رکھیئے" اس نے ہکلا کر کہا،

کلثوم بیٹھ گئی، اس وقت اس کا رنگ فق تھا اور آنکھوں میں ٹمٹماہٹ تھی۔

"جی نہیں" اب کے طالب علی نے کلثوم کے سوال کا جواب دیا۔

"شادی کیجئے گا" کلثوم خطِ مستقیم میں بول رہی تھی،

"جی نہیں — نہیں جی" طالب علی خلا میں اڑتا پھر رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بس یوں سمجھیئے کہ میری آدھی شادی ہو چکی ہے — یعنی منگنی" وہ بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شادی کریں گے" کلثوم بولی:

"جی — جی ہاں، منگیتر سے۔" اس نے وضاحت کی۔

"اور آپ نے کیا سمجھا تھا؟"

"جی — کچھ نہیں"

"اور اگر منگیتر ہی آپ سے شادی نہ کرے؟" کلثوم نے پوچھا۔

" سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" طالب علی بولا۔ "اس کی ماں مان گئی ہے"۔
" خوب!" کلثوم کے چہرے پر گھروندا جلنے لگا۔ اور وہ "خدا حافظ" کہہ کر اٹھ آئی،

حواس باختہ طالب علی نے بوڑھے چپراسی کو اشارے سے پاس بلایا اور بولا۔ " دیکھو بھئی، یہ جو استانی ابھی ابھی دفتر سے نکلی ہیں۔ یہ پاگل تو نہیں؟"

" اجی نہیں صاحب" چپراسی برا مان گیا۔ " یہ تو بہت اچھی استانی ہے، نیک اور نرم طبیعت والی، میں نے پچھلے بیس سال میں ایسی استانی نہ دیکھی نہ سنی۔ کلثوم بی بی نام ہے، مہاجرین ہیں"

اور طالب علی اندر دفتر میں جاکر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اور سر کو ہاتھوں میں یوں جکڑ لیا جیسے اس کا بھیجا اس کی کھوپڑی کو توڑ کر لاوے کی طرح بہہ جانے والا ہے،

کلثوم گھر کی گلی میں داخل ہوئی تو پڑوسیوں کے مکان کی کھڑکی میں گلدستوں اور ہاروں کے ڈھیر لگے تھے، اور کھڑکی سے لے کر گلی کے اس سرے تک اینٹوں کے چولھوں پر دیگیں رکھی تھیں۔ اس گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں بہترین لباسوں میں سجی ہوئی اڑی پھرتی تھیں اور مہندی کے رنگ نے ان کی ہتھیلیوں کو انگارے بنا دیا تھا۔ اچانک اسے رضیہ آپا کے ہونٹوں کے آبلے یاد آئے اور وہ پلٹ کر ایک کیمسٹ کے پاس چلی گئی، ایک دوا لے کر واپس آئی تو ہنگامہ بڑھ چکا تھا۔ شاید بہت سے مہمان کھڑکی والے ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے تھے اور ان کے کپڑوں سے عطر کی لپٹیں اڑ رہی تھیں۔ اس خوشبو

نے کلثوم کو دھکا سا دے دیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے میں اس تیزی سے داخل ہوئی جیسے سنبھل نہ سکی تو منہ کے بل گر پڑے گی مگر اسے منہ کے بل گرنے سے روکنے کے لئے خود اس کے گھر میں بھی خاصی چہل پہل تھی۔ برتن بج رہے تھے۔ نذرہ اور نذیر کودتے اور ناچتے پھر رہے تھے۔ اور زہرہ ایک سینی اٹھائے باورچی خانے کی طرف یوں لپکی جا رہی تھی جیسے پاؤں میں پہیے باندھ رکھے ہیں۔ کلثوم کو دیکھتے ہی وہ اسی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس سے لپٹ گئی۔ پھر لپٹی ہوئی اس سے لٹک گئی اور منہ کھول دیا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" کلثوم پکاری۔

"شش!" زہرہ تڑپ کر ایک طرف جا کھڑی ہوئی اور ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر شرارت سے آنکھیں مٹکانے لگی۔ پھر بولی "وہ سن لیں گے"

"کون؟" کلثوم نے پوچھا۔

"وہ جو دیر سے یہاں آئے ہوئے ہیں" زہرہ نے فرش پر سے سینی اٹھالی۔

"بھئی کون ہیں وہ؟ کیا لینے آئے ہیں؟ کچھ کہو بھی نا" پھر وہ لہجے کو نرم کرکے بولی "بتاؤ نا زہرہ پیاری۔ مذاق کو اتنا لمبا بھی نہیں کرتے کہ بور کر دے بتاؤ"

"شرم آتی ہے آپی" زہرہ نے گردن نیہوڑا کر ایک انگلی کو نچلے ہونٹ پہ رکھ لیا اور شرارت سے مسکرانے لگی۔

"اچھا تو ہم خود دیکھ لیتے ہیں" کلثوم نے کہا اور آگے بڑھنے لگی۔

زہرہ کود کر اس کے سامنے آگئی اور منت کرتے ہوئے بولی "نہیں نہیں آپی۔ آپ کو میری ہی قسم ادھر نہ جائیے۔ ادھر بیگ بی بی آئی ہوئی ہیں۔ ساتھ نوکرانی

بھی ہے، آپ کو ان سے پردہ کرنا چاہیئے۔ سمجھیں آپ؟"

کلثوم ذرا سا سمجھی ضرور، مگر یہ بات ہی ایسی تھی کہ اس کی تفصیل کلثوم کے لئے بہت دلچسپ ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی لئے بولی "میں تو خاک بھی نہیں سمجھی۔"

"اچھا تو سنیئے" زہرہ نے گالی دینے کا انداز اختیار کر لیا "آپ کے رشتے کی بات ہو رہی ہے"۔ اور وہ یہ کہ کر چڑیا کی طرح پھُر سے اڑ گئی۔

کلثوم کو کچھ ایسا لگا جیسے دن کو تارے نکل آئے ہیں، ترمرے سے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور وہ جیسے راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گری۔ ابھی وہ سنبھل نہیں پائی تھی کہ زہرہ جھپاک سے اندر آئی اور سرگوشی میں بولی "میں آپ کے آنے کا کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ چپکے سے یہاں اس دروازے میں سے باتیں سنیئے۔ میں باہر والا دروازہ باہر سے بند کئے جاتی ہوں"۔ اور وہ پھر سے اڑ گئی۔

کلثوم نے دروازے تک زہرہ کا محض اس لئے پیچھا کیا کہ اسے دبوچ کر اس کا ایک پیار لے لے، مگر آج تو زہرہ کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا اور کلثوم اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی بڑے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف چلی۔ پہلے تو جھریوں میں سے اس نے کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اب اندھیرے سے اس کی آنکھیں مانوس ہو چلی تھیں۔ آہستہ سے ایک کرسی اٹھائی اور اسے دروازے کے پاس رکھ کر بڑے کمرے والوں کی باتیں سننے لگی۔ پھر ایک دم اٹھی۔ باہر والے دروازے کو اندر سے بھی بند کر لیا اور کرسی پر اطمینان

سے آ بیٹھی۔

ایک عورت کی بھاری بھاری زکام آلود آواز آئی "میں اسے ساتھ تو لئے آتی پر بہن وہ تو لڑکیوں کی طرح شرماتا ہے۔ ویسے اس نے کلثوم بٹیا کو کئی بار اسکول سے آتے جاتے دیکھا ہے، میں نے پوچھا تمہاری کیا مرضی ہے تو سر جھکا کر بولا جو آپ کی مرضی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ——— یعنی کہ ——— جی ہاں"

اب اماں بولیں "ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ پر دیکھیے، کلثوم کمانے کجانے والی لڑکی ہے، بالکل مردوں کے سے ٹھاٹ ہیں۔ بات یہ ہے کہ ——— وہ ——— خیر، پہلے آپ کہ لیجئے"

اتنے میں شاید زہرہ سینی میں پھل رکھ کر لے آئی۔ تکلفات شروع ہو گئے۔ چند بار چھری سینی سے بجی اور زکام آلود آواز آئی "ماشاءاللہ کلثوم بٹیا کے علاوہ اور بھی تو آمدنی کے ذریعے ہوں گے"

"جی ہاں" اماں کی آواز جھوٹ بولتے ہوئے بلند ہو جاتی تھی "کیوں نہیں۔ اتنا بڑا گھرانا ہے۔ اتنی روپلی میں تو چلنے سے رہا۔ بیٹا ہر مہینے دو سو ڈھائی سو بھیج دیتا ہے۔ اور پھر لڑکیوں کے ابا مرحوم کا بنک میں حساب ہے جو ہندوستان سے پاکستان آگیا ہے، پچھلے مہینے چھ سو نکلوائے بھی۔ بچیوں کو کراکری کا بہت شوق ہے، کھائیں گی انہی برتنوں میں جو آپ کے سامنے ہیں مگر کراکری ایسی ہے کہ پٹیالے والا راجہ بھی دیکھے تو بھونچکا رہ جائے"

"ماشاءاللہ!" مہمان خاتون بولی۔

"اور پھر روپیہ پیسہ تو ہاتھوں کا میل ہے، اِدھر آیا اُدھر گیا۔" اماں بولے چلی گئیں۔ "شادی میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ دونوں کتنے پانی میں ہیں۔ سو میری مرد بیٹی کو تو آپ نے دیکھ لیا۔ مجال ہے جو ماتھے پر کبھی ایک شکن بھی ابھری ہو، تیوری چڑھانا آتا ہی نہیں — اے بیٹی آج تو وہ سارا ڈنر سیٹ ٹوٹ گیا جو تم پچھلے مہینے ڈیڑھ سو میں لائی تھیں —— تو کیا ہوا امی۔ اور آجائے گا۔ بس آپ جیتی رہیں —— شبیر کا کلیجہ ہے اس لڑکی کا۔ باقی رہا آپ کا صاحبزادہ تو بہن —— خیر —— پہلے آپ کہہ لیجئے۔"

"میں تو عرض کر چکی" بھاری بھاری آواز آئی۔ "میں بڑے دعوے سے آپ کی خدمت میں آئی ہوں۔ میری آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے، محلے کے محلے نے یہاں تک میرا پیچھا کیا ہے۔ آپ ہی فرمایئے۔"

"تو سنیئے" اماں بولیں۔ اور کلثوم سراپا کان بن گئی۔

"دیکھیئے" امی نے کہا۔ "میری ایک شرط ہے۔"

"فرمایئے فرمایئے" مہمان خاتون بولی۔ "یہی ہوگا کہ کلثوم بٹیا ایک بار صمد کو دیکھ لے۔"

"اللہ الصمد!" امی کی آواز میں احتجاج تھا۔ "اس کے دیکھنے نہ دیکھنے سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے، میری شرط تو یہ ہے کہ —— سوچ لیجیئے پہلے، تیار ہیں آپ؟"

"آپ فرمایئے تو"

"شرط یہ ہے کہ شادی کے بعد دولہا یہیں اسی گھر میں رہے" اماں نے فیصلہ سنایا۔

چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔

پھر بھاری زکام آلود آواز آئی: "آپ نے تو کمال کر دیا۔ آج تک تو لوگ لڑکیوں کو بیاہ لے جاتے ہیں۔ آپ لڑکے کو بیاہ لانے کی سوچ رہی ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات جو بھی ہو" اماں کا انداز فیصلہ کن تھا "میری پہلی اور آخری شرط یہی ہے"

"سوچ لیجیے" مہمان بولیں۔

"سوچئے آپ" اماں نے جواب دیا "میں کیوں سوچوں، مجھے تو یہیں تک سوچنا تھا سو سوچ چکی"

"یہ فیصلہ ہے؟"

"جی ہاں۔ فیصلہ"

"تو پھر اجازت دیجیے"

"آپ کی مرضی"

"کھایا پیا معاف کیجیے گا"

"کوئی بات نہیں"

"خدا حافظ"

"خدا حافظ"

—— "خدا حافظ" کلثوم نے لپک کر باہر کھلنے والے دروازے کی ایک جھری پر آنکھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔ زنجیر کھول دی اور واپس آ کر کھاٹ پر دھڑام سے گر پڑی۔ اسے اکٹھا بہت سارا رونا آگیا۔ مگر پھر اس نے کچھ سوچ کر آنسو اس زور سے پونچھے کہ آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔ اور جب دروازہ باہر سے کھلا تو اس نے کروٹ بدل کر سونے کا بہانہ کر لیا۔ زہرہ اندر آئی اور پھر دبے پاؤں واپس چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد اماں، فرخ اور رضیہ آئیں اور کلثوم کو سوتا پا کر آہستہ سے دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئیں۔ اور جب کلثوم نے مطلع صاف پایا تو اٹھی۔ بھرّائے ہوئے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور اطمینان سے بیٹھ کر رونے کے لئے کھاٹ کی طرف چلی مگر کھاٹ تک جاتے جاتے اس کے سارے آنسو جیسے جل گئے اور جب وہ کھاٹ پر بیٹھی تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے، اور انگلیاں جس رخ سے چٹخنی چڑھاتے ہوئے مڑی تھیں اسی رخ پر جیسے اکڑ گئی تھیں، مگر پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ایک سوکھی مرجھلی عورت سے کوئی سوکھا مرجھلا ہی شادی کرے گا! اور یہ صمد صاحب کی اماں جو سارے لاہور کو طے کر کے یہاں تک پہنچی ہیں تو کیا اکیلی میں ہی گھورے کا پھول رہ گئی تھی ان کے صاحبزادہ صاحب کے لئے، کیا لٹے پٹوں کی تنہا امید گاہ کلثوم ہی ہے، ایک جنجال تھا سو وہ ایسا بودا نکلا کہ ذرا سی ٹھیس لگنے سے مر تو خیر نہ سکا پر زندگی سے بھاگ ضرور گیا۔ پھر یہ پڑوسی تہاماں کا لاڈلا کہ ——

—— ! ایک چھناکے سے اس کے خیالات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ پڑوس میں چنگھاڑتا اور دہاڑتا ہوا بینڈ بجنے لگا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ابٹن کی خوشبو سے محلے کا محلہ مہک اٹھا تھا۔ اور محلے کی عورتیں چھتوں پر چڑھ کر تماشہ دیکھنے لگی تھیں۔

وہ بھی چھت پر چلی گئی۔ اور ابھی دیوار تک نہیں پہنچی تھی کہ اس نے دیکھا اس کی تینوں بہنیں دونوں بھانجے اور اماں بھی چھت پر آ گئی ہیں۔ پہلے تو وہ اس تعاقب سے چونکی مگر جب اسے احساس ہوا کہ سب نیچے گلی کی رونق دیکھنے آئے ہیں تو اس نے اپنے تنتے ہوئے اعصاب کو ایک لمبی گہری سانس لے کر ڈھیلا چھوڑ دیا اور مسکرا دی۔
اماں نے آتے ہی کہا "کیسے چپکے سے بلی کی طرح آتی ہو کلثوم۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب آئیں، کب سوئیں، کب جاگیں" پھر رضیہ نے کلثوم کے گرد ایک بازو لپیٹ لیا۔ اور سب کی سب دیوار پر سے نیچے دیکھنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نیچے گلی میں بھڑوں کی طرح بچوں کا بھی ایک چھتہ تھا جسے چھیڑ دیا گیا ہے، بچے یہاں سے وہاں بھاگے اور لڑھکے پھرتے تھے۔ اور نوجوانوں یا بوڑھوں کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ سب دیر تک ایک ہی زاویے پر کھڑی تماشہ دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک کلثوم پیچھے ہٹ آئی تو سب جیسے ایک ہی تار سے بندھی ہوئی تھیں۔ سب پیچھے ہٹ آئیں "کیا بات ہے میری جان؟" رضیہ نے پوچھا۔

کلثوم نے صرف اتنا کہا "دیر تک گلی میں جھانکتے رہنے میں کچھ عجیب بے حیائی سی لگتی ہے"

کلثوم نے جیسے سب کو ڈانٹ دیا تھا۔ سب آہستہ آہستہ نیچے اتر آئیں اور اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ کلثوم منتظر رہی کہ کوئی تو اس سے آج کے واقعے کا ذکر کرے گا مگر کوئی نہ بولا۔ رضیہ تک نے اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ آخر کلثوم نے خود ہی اس قصے کو چھیڑ دیا "آج کون آیا تھا امی؟"

اماں چونکیں "وہ۔ کیا نام ہے —— ایک یہیں اڑوس پڑوس کی عورت

تھی - ہمانے کیا نام تھا - عجیب بھدا سا نام تھا - عصفورہ یا صرف صفورہ وہ آئی تھی دوستی کرنا چاہتی تھی مجھ سے یہ ٹنٹا نہیں چلتا، ویسے مجھے اچھی بھی نہیں لگی - آواز ——— ہی کچھ ایسی تھی جیسے مرد نے عورت کا بھیس بدل رکھا ہے"۔ اماں صاف جھوٹ بول گئیں - انہوں نے کلثوم کے سوا باقی سب کو خوب گھور گھور کر دیکھا اس لئے سب خاموش رہیں - البتہ زہرہ نے ایک بار پہلو بدل کر سر کھجایا اور گلا صاف کر کے خاموش ہو گئی۔

کلثوم وہاں سے اٹھ آئی - کافی دیر کے بعد موقع پاکر زہرہ اس کے پاس آئی مگر روتی ہوئی، آتے ہی کلثوم کی گود میں سر رکھ کر بلکنے لگی اور کلثوم نے کہا "کوئی بات نہیں پیاری، امی کو اگر مجھ سے ایسی ہی ضد ہے تو میں بھی کچھ کم ضدی نہیں ہوں - ایک دن انہیں اچانک خبر ملے گی کہ کلثوم نے کسی سے بیاہ رچا لیا چپکے سے - تب چین آئے گا انہیں تمہیں میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی انشاءاللہ تم کیوں یہاں گھلتی رہی اور عورت سے مرد بنتی رہو - اور دیکھو - بس جینے دو مہینے کی بات ہے، میں اسی کھوج میں ہوں، دیکھوں گی امی کب تک ———" وہ کچھ نگل کر خاموش ہو گئی،

زہرہ آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھی اور پھر کلثوم سے لپٹ کر بولی "میری پیاری آپی"۔ پھر وہ اس سے اچانک الگ ہو گئی "آپ کو تو بخار ہے"۔

"اری نہیں" وہ بولی "بخار وخار نہیں ہے، یونہی بس ذرا سا غصے سے تپ گئی تھی"۔

اس غصے نے کلثوم کی آنکھوں سے حیا کی وہ چمک غائب کر دی جو لالچ سے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے، وہ جب اسکول جاتے ہوئے بازار میں سے گزرتی تو کچھ ایسے مردانہ ٹھسے سے جیسے وہ اپنے عورت پنے کو گھر میں بھول

آئی ہے، اس کے گھر والوں کو بھی اس تبدیلی کا احساس تھا۔ خصوصاً اماں تو بری طرح چونکی ہوئی تھیں۔ البتہ انہی دنوں اسے مہینے بھر کی تنخواہ مل گئی تو اس نے ایک ایک پائی اماں کے قدموں میں لاڈالی۔ اور ماں کے علاوہ دوسروں کے شکوک بھی اسّی روپیوں کے نیچے دب گئے، لیکن جب وہ شام کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں قدم رکھتی تو اس کا عورت پنا کسی گوشے سے اٹھ کر آتا اور اس کے پیکر میں حلول کر جاتا۔ اور وہ ایک لمبی چوڑی انگڑائی لے کر اٹھی ہوئی باہوں کو گراتی اور ہاتھوں سے گھٹنوں کو بجا کر کہتی "ہائے ری یہ اجاڑ زندگی!" پھر وہ کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی اور ماضی کے ملبے میں سے ان خوابوں کو ٹٹول کر نکالنے کی کوشش کرتی رہتی جن میں سنہری کلغیوں اور لمبی لمبی چیرویں آنکھوں والے شہزادے اس کے انبالے والے کمرے کی دریچی میں سے پھاند کر آتے تھے اور اسے اپنی باہوں پر اٹھا کر دور دراز کی نگریوں میں نکل جاتے تھے جہاں جھروکوں کے حاشیوں میں پھولوں کے حاشیے تھے اور ان حاشیوں کے اندر گھاس کے قطعے تھے جس پر ست رنگی چڑیاں پھدکتی اور چہکتی تھیں اور کہیں کہیں انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کنج تھے جن کے سایوں میں ——— ، مگر ان خوابوں کو تو جیسے پھپھوندی لگ گئی تھی۔ اسے کچھ عجیب تعفن سا محسوس ہوتا اور وہ پلنگ پر بیٹھ کر یوں ہی بیکار دیوار کو دیکھنے لگتی۔

ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ دن میں دو ایک سے زیادہ مردوں سے ملاقات ہی نہ ہو سکتی تھی، طالب علی نصف شادی شدہ تھا اور بوڑھے چپراسی کے مسوڑوں میں دانت جھول رہے تھے، وہ کبھی کبھی کسی کالج میں مباحثہ سننے چلی جاتی، شاعروں میں جا بیٹھتی۔ تصویروں کی نمائشوں میں بھی گئی، وزیر اعظم کی تقریر سننے بھی جا نکلی مگر جہاں

جاتی وہاں ڈھیر سی عورتوں کے درمیان ایک صفر بن کر بیٹھ جانا پڑتا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی دور نوجوانوں کے چہروں کے کنول کھلے ہوتے۔ کسی کے بال سپید ہونے پیچھے جا رہے ہیں۔ تو کسی کے بالوں کا ایک گچھا سا اس کے ماتھے پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ کسی کی مونچھیں ہلال کی سی قوسوں کی طرح ترشی ہوئی ہیں تو کسی کی مونچھوں کے منڈ جانے سے اس کے اوپر کے ہونٹ کی نمایاں محراب میں جیسے اس کی جوانی کے سارے جذبات نے سمٹ کر بسیرا بنا لیا ہے۔ کسی کی کنپٹیوں کے بال اس کے کانوں کی لووں تک پہنچ کر اسے شہزادہ سلیم بنائے ہوئے ہیں اور کسی کی ٹائی کی ناٹ بالکل ڈیوک آف ونڈسر کی ناٹ کی طرح ننھی سی پیاز کی طرح لمبوتری اور کسی ہوئی ہے، اور پھر اسے قریب ہی پولیس کا سپاہی کھڑا نظر آجاتا اور وہ سوچتی۔ یہ بھی برا نہیں۔ کوئی سا بھی مرد برا نہیں، مرد جب تک مرد ہے برا ہو ہی نہیں سکتا جیسے عورت جب تک عورت ہے بہت اچھی ہے لیکن جب مردوں کے سے کام کرنے لگتی ہے تو قدرت کو چاہیئے کہ اس کی مونچھیں اگا دے ———

اور اس کا جی چاہتا کہ کوئی اسے عورتوں کے اس ڈھیر میں سے یوں نکال لے جائے جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے، اور بھرے جلسے میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہیں نکل جائے۔ کسی ایسی نگری میں جہاں ———، مگر یہ تو وہی مائی کے سڑے بسے خواب تھے! ——— کئی بار اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ سر کے بل کھڑی ہے اور اگر سر کے بل نہیں کھڑی تو اسے کھڑے ہو جانا چاہیئے ورنہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ پھر اسے سامنے زمین سمندر کی لہروں کی طرح ابھرتی بیٹھتی محسوس ہوتی اور اس کی رفتار کا توازن بگڑ جاتا، کئی بار اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے سر کا پچھلا حصہ سوچ رہا ہے، اور اگر سوچن کی یہ رفتار جاری رہی تو یہ حصہ پھوڑا بن کر

پھٹ جائے گا۔ اس کی انگلیاں مستقل طور پر لرزتی رہتیں اور اسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہوتا۔ وہ جلدی جلدی سے سانسیں لے کر سانسوں کی آمد و شد کو درست کرتی اور اپنے خوابوں کے گھوڑے پر سو جاتی، نہ جانے کیا بات ہوئی کہ انہی دنوں اسے کتابوں، کاپیوں، اخباروں اور دیواروں تک پر اپنے دستخط کرنے کی لت پڑ گئی۔ جو چیز بھی اٹھاؤ اس پر کلثوم کے دستخط ثبت ہیں۔ اور کچھ نہیں تو انگلی سے آسمان پر دستخط کر رہی ہے۔

کبھی کبھی نذرا اور نذیر کو دیکھ کر اور پھر خاص طور سے رضیہ کو کچھ سنتیا دیکھ کر اسے یوں ہی سا احساس ہوتا کہ اس کا شادی کے جھمیلوں میں پڑنا بہت بڑا ظلم ہوگا، مگر پھر اچانک کہیں سے ہوا کا جھونکا آتا اور اسے گدگدا کر نکل جاتا۔ بدلی کی ایک کترن چاند پر سے گزرتی اور اسے غزلوں کے سب منتخب اشعار یاد آجاتے، پڑوس کے صحن میں شیشم کی شاخ پر طوطوں کے غول آپس میں گپیں ہانکتے اور منڈیروں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں بڑی آسودگی سے پھدکتیں تو اس کے اندر کچھ ابلنے لگتا اور پھر وہ ذرا سی انگڑائی لے کر صرف اتنا کہہ پاتی "ہائے ری یہ اجڑی پجڑی زندگی!"

ایک دن وہ اسکول سے گھر آئی تو سارے راستے میں لٹکے ہوئے ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے سڑک پر کلثوم کلثوم لکھتی چلی آئی۔ اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا لٹکا ہوا ہاتھ اٹھا اور اس نے آسمان پر دستخط کرنا شروع کئے، ابھی اس نے کلثو ہی لکھا تھا کہ زہرہ بھاگی آئی اور بولی "جادو وادو سے کچھ نہیں ہوگا آپی۔ جن کو آنا تھا وہ تو آ بھی چکے۔"

"کیا؟" کلثوم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے کمرے میں مت جائیے گا" زہرہ نے شرارت سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"کیوں نہ جاؤں؟"

"وہاں ایک صاحب تشریف رکھتے ہیں"

"کون صاحب؟"

"وہ جو ہوتے ہیں"

"لاحول ولا قوۃ"

"نہیں، ان کا نام تو کچھ اور بھلا سا ہے"

کلثوم کو غصہ آگیا "یہ کیا بکواس ہے!"

"محمد ادریس" زہرہ کے ہونٹوں سے یہ نام جیسے مارے ڈر کے ٹپک پڑا۔ پھر "شش" کرتی ہوئی بڑھی اور کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے باورچی خانے میں لے گئی "یہاں بیٹھیے"

وہاں فرخ اور رضیہ پہلے سے موجود تھیں اور نذر اور نذیر بیٹھے پھلکیاں تلے جانے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کلثوم دروازے پر آکر یوں کھڑی ہو گئی جیسے زہرہ اسے حوالات میں لے آئی ہے، فرخ فوراً اٹھی اور زہرہ سے بولی "کلثوم آگئی ہے۔ تو اب تم ادھر چولھے کے پاس بیٹھ کر رضیہ کا ہاتھ بٹاؤ۔ بھاگ بھاگ کر بار بار ادھر مت جاؤ، بڑی بہنوں کے رشتے طے ہونے لگیں تو چھوٹیاں روتی ہیں۔ تمہاری طرح عید منانے نہیں بیٹھ جاتیں" یہ وعظ پلا کر وہ کلثوم کے پاس آئی اور اس کے پیٹ میں گدگدی کی سنسنی سے بل کھا کر کلثوم وہیں بیٹھ گئی اور پھر یونہی بیٹھے بیٹھے گھسٹتی ہوئی رضیہ کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ دی۔ بڑے پیار سے بولی "یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے آپا"۔

"سودا ہو رہا ہے میری جان"۔ رضیہ نے پھلکیوں کی طرح تل کر کہا "جو صاحب امیدوار ہیں انہوں نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہے اپنی اماں کے ساتھ۔ سوچا ہوگا لگے ہاتھوں اپنا جلوہ دکھاتے چلیں۔ زہرہ نے ایک جھلکی دیکھ پائی ہے، کہتی ہے ایسا انگارہ کا سا رنگ ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں پر منہ پر ڈاڑھی ہے"

"سنہری ڈاڑھی" زہرہ ہنسی۔

"یہ لوگ تمہارا رشتہ طے کرنے آئے ہیں۔ بس تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک بار تمہیں اس کو دیکھنے کا اور اسے تم کو دیکھنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔ میں نے تو چیخ چیخ کر امی سے کہا کہ میری جان کلثوم اتنی بے حیا نہیں جو ہونے والے میاں کے سامنے آنکھیں پھاڑے چلی جائے۔ اس کے بدلے میں وہ تو دعا مانگے گی کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ فرخ نے بھی تھوڑا سا میرا ساتھ دیا پر امی کہتی ہیں کہ کلثوم پڑھی لکھی ہے، چلی جائے گی سامنے۔ جیسے پڑھنے لکھنے کی فیس شرم اور حیا ہی تو ہے۔ اونہہ!"

کلثوم مسکرائی "اس میں ہرج ہی کیا ہے آپا۔ چلی جاؤں گی، وہ مجھے کھا تھوڑی جائے گا، جاؤں؟"

رضیہ کے ہاتھ سے چمٹی چھوٹ کر کڑکڑاتے گھی میں گر پڑی۔ اور کڑکڑاتے گھی کا ایک قطرہ فرائنگ پین میں سے نکل کر زہرہ کے ہاتھ پر جا گرا "ہائے"! رضیہ اور زہرہ ایک ساتھ تڑپیں اور پھر رضیہ نے کلثوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رونا شروع کر دیا "مسکرا میری جان۔ میں روتی ہوں۔ تو مسکرا ـــــ" کلثوم مارے ڈر کے مسکرانے لگی۔ اور رضیہ بولی "یوں ـــــ اور میں کہوں ویسے لڑکی سمجھدار ہو

تو دیکھنے دکھانے سے کچھ نہیں بگڑتا اور میری جان کلثو تو بقراط ہے - کوئی ہرج نہیں میری جان۔"

کلثوم کو سہارا ملا " لڑکی کی جات تو سارے گھر کی امانت ہے آپا - اور میں امانت میں خیانت نہیں کرتی - میں تو کوئی گناہ نہیں کرتی آپا - جاؤں؟"

رضیہ اٹھی - "ٹھہرو میں امی سے کہہ دوں" اور وہ باہر چلی گئی -

زہرہ نے مسمسی صورت بنا کر پوچھا " میں آپ کے ساتھ رہوں گی نا اپی "

کلثوم نے مسکرا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا - اور پھر دونوں تلی ہوئی پھلکیاں نکالنے لگیں - کافی دیر تک وہ یونہی خاموش بیٹھی رہیں کہ اچانک باہر ایک ہنگامہ ہو گیا - اماں - فرخ اور رضیہ زور زور سے باتیں کرنے لگیں اور نذر اور نذیر رونے لگے - کلثوم اور زہرہ باہر لپکیں تو تینوں ایک دم خاموش ہو گئیں - مگر جب دونوں قریب پہنچیں تو رضیہ نے کلثوم سے لپٹ کر کہا " میں امی کی جگہ ہوتی تو ایسا کبھی نہ کرتی میری جان - ٹھنسوائے بھی سب کو اور جوتی بھی سڑاتی رہے - کیوں؟" ———

" وہ چلے گئے؟" زہرہ نے اماں سے پوچھا -

" تو کیا وہ تمہارے باپ تھے جو بیٹھے رہتے؟" اماں نے جل کر کہا —" ان سب بد ذاتوں نے مجھے تو کھا لیا، کلیجے میں پیپ ڈال دی - میں پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی - یہ سب پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئیں - حرامزادیاں نہ جانے کس گناہ کے بدلے میں مجھ کم بخت کے نصیبوں میں گھسی چلی آئیں - اللہ کرے موت آئے، کیڑے پڑیں تن بدن میں - الو کی پٹھیاں "

اماں روتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ فرخ نے ان کا تعاقب کیا اور کلثوم بت کی طرح کھڑی خلا میں دیکھتی رہی، پھر اس نے انگلی سے ہوا میں اپنے دستخط کئے اور رضیہ کی آسیبی آنکھوں میں اپنی ویران آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا ہوا تھا آپا؟" زہرہ نے کلثوم کی آنکھوں کے سوال کو لفظوں میں ادا کر دیا۔

"ہونا کیا تھا۔" رضیہ پھٹ پڑی "اچھا خاصا لڑکا تھا۔ لاٹ صاحب کے دفتر میں کلرک ہے، ذرا سی داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کیا ہوا۔ میں تو بھری برات میں سے اسے پکڑ لاتی اور گھٹنوں تلے دے کر مونڈ ڈالتی پر امی نے پانی ہی پھیر دیا۔ بولیں۔ میں اپنی کلثوم کو ایک پل کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی دولھا یہیں آ کر رہے بسے تو ٹھیک ہے ورنہ، کہنے لگیں، کلثوم کنواری بیٹھی رہے گی۔ کنواریاں بھی جی لیتی ہیں۔ تمہارے پیار کا کچھ ایسا پہاڑ پھٹ پڑا ہے امی پر کہ کہتی ہیں میں تو اپنی مردہ بیٹی کو اپنے سے جدا کر دوں تو اپنے جسم سے روح کو جدا کر دوں

کلثوم کچھ نہ بولی۔ اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں کھاٹ پر بیٹھ کر اور کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک کر چہرے کو ہاتھوں میں لے لیا۔ دیر تک وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ چھت پر سے ایک ہوائی جہاز گزر گیا۔ گلی میں سے گزرتی ہوئی ایک موٹر نے زور سے ہارن بجایا۔ دو چڑیاں چھت پر سے گتھم گتھا ہو کر فرش پر گر پڑیں اور پھر اڑ گئیں۔ مگر کلثوم اسی حالت میں بیٹھی رہی، کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کہنی گھٹنے پر سے کھسکا دی گئی تو وہ منہ کے بل فرش پر گر جائے گی۔ زہرہ

نے اس کو اس حالت میں دیکھا تو رضیہ کو جا کر بتایا - اماں نے سن لیا۔ ساتھ ہی فرخ بھی بھاگی آئی - اور کلثوم کے سامنے ایک ہجوم لگ گیا۔

کلثوم ایک جھٹکے سے تن کر یوں کھڑی ہو گئی کہ اس کے بال پیٹھ پر سے ہٹ کر اس کے منہ اور سینے پر بکھر گئے - اس نے اس زور سے دونوں ہاتھ جوڑے کہ تالی سی بج اٹھی - پھر ایک ہاتھ سے بالوں کو آنکھوں پر سے ہٹایا - اور پھر سے ہاتھ جوڑے - "مجھے بخشئے" وہ بڑی تلخی سے بولی۔" مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے - خدا کے لئے مجھے بخشئے - بس"

زہرہ نے تو جیسے اپنے آپ کو پہلا مخاطب سمجھا۔ بلکتی ہوئی باہر بھاگ گئی، پھر فرخ بھی چلی گئی - اماں اسے گھور گھور کر دیکھتی رہیں اور انتظار کرتی رہیں کہ وہ جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کر دے مگر مایوس ہو کر وہ بھی چلی گئیں۔ اب صرف رضیہ رہ گئی تھی - "کلثو میری جان" اس نے سرگوشی کی مگر ہاتھ جڑے رہے اور وہ بھی شکست کھا کر پلٹ گئی - کمرہ خالی ہونے کے بعد بھی کلثوم اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی رہی - پھر ایک لمبی سانس لے کر اس نے ہاتھ نیچے گرا دیئے اور کھاٹ پر دھم سے بیٹھ گئی - چند لمحوں کے بعد وہ بھڑک کر اٹھی - تولیے سے اپنا چہرہ خوب خوب رگڑا اور باہر چلی گئی -

وہ آنگن میں دیر تک ٹہلتی رہی - اماں اور فرخ دیر تک باورچی خانے میں بیٹھی کھسر پھسر کرتی رہیں - اور رضیہ نل کی پرلی طرف بیٹھی کچھ بینتی رہی - البتہ زہرہ غائب تھی - کلثوم نے کنکھیوں سے آنگن کے سب گوشوں میں اور پھر چھت پر بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی اسے کہیں نہ پا کر وہ گھبرا گئی اور اس کے

زہرہ اپنی چارپائی پر روتے روتے سو گئی تھی۔ اور اس کے گال پر ایک آنسو رک گیا تھا۔ کلثوم نے جھک کر اسے وہیں پیار کیا اور رکے ہوئے آنسو کو جیسے چوس لیا۔ زہرہ نے کروٹ بدلی اور نیند میں رونے لگی۔ اچانک عقب سے رضیہ بولی "یہ بات ہے! اور ہم میری جان؟ ہم کہاں جائیں؟" ـــــ کلثوم نے رضیہ کو بھی چوم لیا اور رضیہ جیسے سینے پر تمغہ سجائے مسکراتی اور اکڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بہت دنوں تک اس گھر میں ایک اجنبی سا سناٹا طاری رہا۔ سب ایک ساتھ کھانا کھاتے، ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ سوتے مگر جیسے سب کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ جب کوئی ایک دوسرے سے بات کرتا تو اس احتیاط سے کہ مبادا سناٹا چیخ نہ جائے، رات کے اندھیرے میں کلثوم کبھی کبھی اپنے کمرے میں منہ پر لحاف اوڑھ کر وہی پرانا شعر دیر تک گنگناتی رہتی ع:-

زندگی! چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا!

اور اپنی اپنی کھاٹوں پر اماں اور بہنیں چپکے چپکے روتیں اور سناٹا ہونکنے لگتا!

ایک دن کلثوم کو اسکول میں معلوم ہوا کہ جمال چھٹی کاٹ کر واپس آگیا ہے اور کل سے دفتر میں بھی آنے لگے گا۔ اس وقت وہ دسویں کی لڑکیوں کو حافظ کی وہ غزل پڑھانے چلی تھی جس ـ مطلع کا پہلا مصرع ہے ع:- دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را

باہر تیز ہوا چل رہی تھی، اور سامنے لان کے پرلے سرے پر نیموں کی شاخیں اعصابی ہلکورے لے رہی تھیں۔ سب درختوں اور بوٹوں کے پتے ایک رخ کو جھک کر لرز رہے تھے، اور برآمدے میں خشک پتوں کی ایک قطار اڑتی اور چیختی جا رہی تھی۔ بہت سی چڑیاں روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے اندر آ کر شور مچانے لگی تھیں اور بادل ڈھول بجا رہا تھا۔

مطلع پڑھانے کے بعد جب وہ اس شعر پہ پہنچی ؎

کشتی شکستگانیم، اے بادِ شرطہ برخیز   باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

تو وہ ایک دم رک گئی، اور بولی "دیکھو بھئی لڑکیو، فی الحال ایک ہی شعر کافی ہے اسے ازبر کر لو جب تک میں آتی ہوں" وہ باہر آ گئی۔ نمی سے لدی ہوئی ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے بالوں کو پریشان کرتا آگے نکل گیا۔ اور کلثوم گنگناتی چلی گئی ــ کشتی شکستگانیم ــــ

کھیل کے میدان میں عربی کی استانی شاید دھوپ کی تلاش میں آئی تھیں اور اب تک وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے تین لڑکیوں کو کان پکڑوا رکھے تھے "ضرب تنا نہیں ضربنا" وہ چیخ رہی تھیں۔ پھر ایکا ایکی جیسے ہوا کے ایک تند و تیز جھونکے نے لڑکیوں کو دھکا دے دیا اور وہ سر کے بل استانی کے قدموں میں جا گریں۔ سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ استانی نے سب کو چھٹی دے دی۔ لڑکیاں اڑتے ہوئے پتوں کی طرح ادھر ادھر منتشر ہو گئیں اور استانی اپنی کتابیں سنبھالتے ہوئے اچانک چپ کر رہ گئیں۔ کلثوم کی دبی دبی گنگناہٹ کو ہوائیں اسی رخ پہ اڑائے لا رہی تھیں۔

ع:۔ کشتی شکستگانیم ، اے بادِ شرطہ برخیز

میدان کے پرلے سرے پہ کلثوم باہیں ہوا میں بلند کئے بڑھی جا رہی تھی اور "اے بادِ شرطہ برخیز۔ اے بادِ شرطہ برخیز" کی تکرار سے اس کی گنگناہٹ بے حد پراسرار ہو رہی تھی۔ پھر جب وہ چنبیلی کی جھاڑیوں کی طرف بڑھی تو ننھی ننھی بوندیں گرنے لگیں۔ جھاڑیوں کے نیچے چنبیلی کے جھڑے ہوئے پھولوں کے ڈھیر لگے تھے اور ہر بوند کے مس کے ساتھ یہ پھول تڑپ تڑپ اٹھتے تھے۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ پھولوں کی اس بساط کو پار کر گئی۔ اور سفیدے کے تنہا درخت کی طرح بڑھی۔ مگر اچانک جیسے چنبیلی کی جھاڑیاں اس کے قدموں سے لپٹ گئیں۔ سفیدے کے تنے کے پاس کوئی نہیں تھا!

"اے بادِ شرطہ، برخیز!" اس نے دعا مانگی۔ اور پھر ہولے ہولے دبتی اور گھٹتی ہوئی آواز میں اس نے بڑے دکھ سے گایا (ع:۔ باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را!
وہ رو دی، بڑھ کر وہ سفیدے کے صاف ستھرے تنے سے لپٹ گئی اور اسے بہت سے

پیار کر ڈالے، بلندیں اس کے کوٹ میں جذب ہو کر اس کے بلاؤز تک پہنچ گئی تھیں مگر وہ دیر تک وہاں کھڑی غیرارادی طور پر گنگناتی رہی ——

واپس اسکول میں جاکر وہ کرسی میں ڈوب گئی، اور لڑکیاں چپ چاپ اپنا سبق یاد کرتی رہیں، واپس گھر آئی تو دروازے میں داخل ہوتے وقت وہ حافظ کے شعر کا دوسرا مصرع گنگنا رہی تھی ع :- باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

اچانک زہرہ بھاگتی ہوئی آئی اور سرگوشی میں بولی "جلدی سے کمرے میں چلی جایئے آپی۔ آج کوئی اور امیدوار آئے ہوئے ہیں۔"

کلثوم اپنے خوابوں کے گھوڑے پر جیسے ایڑیں لگانے لگی۔

وہ کمرے میں گئی تو بڑے کمرے میں سے مہمان اُٹھ کر چلا گیا۔ اماں اور فرخ اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔

دونوں واپس آئیں تو ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہروں کی بہت سی جھریاں غائب تھیں۔ صفیہ بھی مسکرا رہی تھی اور زہرہ کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔

کلثوم بُت کی طرح دروازے پہ کھڑی رہی۔

کچھ دیر تک سناٹا طاری رہا۔

پھر اماں بولیں۔ "پتہ ہے آج کون آیا تھا؟"

"جی نہیں" کلثوم نے جواب دیا۔

"جمال آیا تھا!" اماں نے جیسے تھیلے میں سے بلی نکال دی۔ سب ہنسنے لگیں اور سب نے کلثوم کے چہرے کا جائزہ لینے کے لئے اسے گھورنا شروع کر دیا۔

کلثوم ذرا سی چونکی اور پھٹے ہوئے بادلوں پہ ایک نظر دوڑا کر پھر اماں کو دیکھنے لگی۔ سناٹے کا ایک اور ریلا آیا اور گزر گیا۔

اماں بولیں "پتہ ہے کیوں آیا تھا؟"

"جی نہیں" کلثوم نے کہا۔

"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے"۔ اماں بولیں۔

"اور وہ شادی کے بعد یہیں ہمارے گھر میں رہے گا"۔ فرخ بولی۔

"وہ مان گیا ہے"۔ رضیہ چہکی۔

ہونٹوں کی لَو بجھ گئی۔

سناٹا پھر سے طاری ہو گیا۔

اور اس سناٹے کو کلثوم کی غیر قدرتی آواز نے تلوار کی طرح کاٹ دیا "اگر یہ بات ہے تو میں شادی نہیں کروں گی"۔

سب کی مسکراہٹیں مٹ گئیں اور مٹی ہوئی جھریاں ابھر آئیں۔

"جمال سے بھی؟" اماں نے جیسے واسطہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" کلثوم کی آواز غیر معمولی طور پر بھاری اور گونجیلی ہو رہی تھی "میں جمال سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی"۔

"کیوں"؟ اماں نے اب کے غصے سے پوچھا۔

اور کلثوم نے اپنے اوپر کے ہونٹ والے روئیں چھپا کر کہا "میں مرد بن چکی ہوں!" اور پھر وہ بڑی بے پروائی سے انگلی اٹھا کر ہوا میں دستخط کرنے لگی۔

سناٹے کا ایک اور ریلا آیا اور وہیں منجمد ہو کر رہ گیا۔